ادب کا نو مزاحمتی رجحان
The New York
NEW YORK, WEDNESDAY, SEPTE
U.S. ATTA
HIJACKED JETS DESTR
AND HIT PENTAGON
CREEPING HORROR
Buildings Burn
as Onlooker
for Elusive Safety
9/11
اور
پاکستانی اردو افسانہ
منتخب افسانے
انتخاب و تجزیہ
نجیبہ عارف
پورب اکادمی

عبداللہ غوری
مینجنگ ڈائریکٹر: حسنین سیالوی
بک کتب پراجیکٹ
گروپ میں شامل ہونے کے لیے واٹس ایپ کیجئے
03478848884

9/11

اور

پاکستانی اردو افسانہ

منتخب افسانے

انتخاب و تجزیہ

نجیبہ عارف

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اوّل: مئی ۲۰۱۱ء

ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 -581 9410, 0301 - 559 58 610

ای میل: poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

Nine Eleven Aur Pakistani Urdu Afsana

Compiled by: Dr. Najiba Arif

Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

۸۹۱.۴۳۹۳

ن ج ب عارف، نجیبہ

9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ / نجیبہ عارف (مرتب).-

اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۱ء

۲۶۰ ص

۱. اُردو افسانے - مجموعے

۲. اُردو افسانے

رب المشرقین

اور رب المغربین!

کہاں ہے تو؟

فہرست

منتخب افسانے

سیّد مظہر جمیل

پیش لفظ

ادبی تنقید کا بنیادی وظیفہ تو یہی ہے کہ وہ تخلیقی فن پاروں کی معنوی جہات کی نشان دہی کرے اور ان میں چھپے ہوئے معنیاتی امکانات کی موجودگی (یا عدم موجودگی) کے تجزیاتی مطالعے سے فن پارے کے متن میں نہاں احساسِ جمال اور فسوں کاریِ حیات کے اسرار و رموز کو، جس حد تک بھی ممکن ہو سکے، منکشف کرے۔ اس مقصد کے حصول میں جہاں تنقید کو تخلیقی متن کے ظاہر و باطن اور واقعاتی و اسلوبیاتی رشتوں کے درمیان موجود نظام کو سمجھنا ہوتا ہے، وہیں ان سرچشموں تک بھی رسائی حاصل کرنی پڑتی ہے جہاں سے تخلیقی تخیل کا دھارا پھوٹتا ہے۔ تفہیم و تحسین کے اسی پیچیدہ عمل میں جہاں مختلف زاویے اور معیارات کے استعمال کی گنجائشیں نکلتی ہیں، وہیں ایسے مختلف فلسفہ ہائے زیست کی توجیہات بھی بے معنی نہیں ٹھہرتیں جو انسانی معاملات سے سروکار رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ عمرانی، نفسیاتی، جدلیاتی ہو کہ تاثراتی، ہیئتی یا جمالیاتی مکاتبِ نقد، سب کی خواہش اور کوشش متن کے پیچ در پیچ اسرار و رموز کے انکشاف ہی سے عبارت ہوتی ہے اور یہ کام تخلیق کے معنوی منبع تک پہنچے بغیر ممکن نہیں۔ جس طرح گزشتہ صدی میں دو عالمی جنگوں نے مغرب و مشرق کے فکری رویوں، فلسفوں، نظریوں اور حسی ضابطوں پر جو غیر معمولی اثرات مرتب کیے ہیں اور ان کے نتیجے میں برپا ہونے والے قتالِ عظیم نے اور آشوبِ حیات نے انسانی جذبات و احساسات میں تیز و تند تموج پیدا کیے ہیں، وہ دنیا بھر کی زبان کے ادب میں کسی نہ کسی سطح اور انداز میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ بے شک مذکورہ عالمی جنگوں کے بعد کے دنیا واقعاتی و حیاتی اعتبار سے بیش از بیں عالمِ شش جہات سے مختلف ثابت ہوئی ہے۔ جیسے اکیسویں صدی کے پہلے برس (۲۰۰۱ء) نیویارک میں وقوع پذیر ہونے والے اس خونی واقعے نے جسے عرفِ عام میں 9/11 (گیارہ ستمبر) کا نام دیا گیا ہے اور جس میں امریکی قوت و سطوت کی دو عظیم اور بلند عمارتوں کو

نامعلوم دہشت گردوں نے منہدم کر کے نوزائیدہ عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کے تانے بانے اور یک قطبی معاشرتی، سماجی اور معاشی کائنات کے بیخ و بن کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس محیر العقول واقعے کی ہلاکت آفرینی جنگِ عظیم دوم میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی ہلاکت آفرینی اور خوں آشامی کا مقابلہ تو نہیں کرتی لیکن عالمی تناظر میں اس کے نتائج و عواقب جنگِ عظیم کے اثرات سے کہیں زیادہ مہلک اور دور رَس ہیں اور اس کے ردِ عمل میں دنیا بھر کے ادب میں نئے مزاحمتی رویوں نے جنم لیا ہے۔

نجیبہ عارف نے اردو فکشن میں گیارہ ستمبر کے اثرات کا جس انہماک اور توجہ سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، وہ معاصر عملی تنقید میں تازہ کارانہ فعالیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انھوں نے نقوش اور التباسِ نقوش کی نشان دہی کر کے عمرانی اندازِ نقد کو استحکام بخشا ہے۔ اس ضمن میں کچھ عرض کرنے سے قبل میں اپنے اس تاثر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر جائزہ موضوع کے انتخاب سے لے کر افسانوں کے تجزیاتی مطالعے تک غیر معمولی اور پختگی اور جاذبیت کا حامل ہے اور انھوں نے اس عمومیت، سرسری پن اور کلیشے نگاری سے یقیناً پہلو تہی کی ہے جو بالعموم معاصر تنقید کا مزاج بن گیا ہے اور اس تجزیاتی جائزے کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اردو افسانے کی تنقید کم از کم اکیسویں صدی کی دہلیز تک تو آئی ہے جہاں اس کی اپروچ اور طریقِ کار کی کایا کلپ (Paradigm shift) کے امکان پیدا ہوئے ہیں جس کے ذریعے معاصر تنقید کو غیر منطقی سریت کے دھندلکے سے نکل کر معروضی سچائیوں اور کمپیوٹر ایجاد ریئلٹی (reality) سے مکالمے کی توفیق حاصل ہو سکے۔ اس قسم کے جائزے کا مقصد محض ناموں کی کھتونی نہیں ہوتا بلکہ نمایاں ہوتے ہوئے فکری و تخلیقی رویوں اور اندیشوں کی نشان دہی ہوتا ہے۔ اس نکتۂ نظر سے بھی نجیبہ عارف کے مضمون میں ۹/۱۱ کے زیرِ اثر لکھے جانے والی کم و بیش سب ہی نمائندہ تحریروں پر گفتگو کر لی گئی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد کی دنیا کسی مابعدیت (پوسٹ ماڈرن ازم، پوسٹ ہیومن ازم، پوسٹ اسٹرکچرل ازم، پوسٹ کولونیل، پوسٹ مارکس ازم، پوسٹ فیمن ازم وغیرہ) کی زائیدہ نہیں ہے اور نہ اسے کسی خاص فکر و فلسفے سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یقیناً کوئی کلام نہیں کہ مابعد کی حدود و قیود ہمیشہ نامعلوم ہوتی ہے کیوں کہ بعد کا تجربہ کرنے کے بعد مابعد، مابعد نہیں رہتا، ماقبل بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو ۹/۱۱ کا اندوہناک سانحہ اپنا

ایک ' ماتحت ' بھی رکھتا ہے۔ جس سے صرفِ نگاہ کرنے کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا اور ہم سب جانتے ہیں کہ ' ماتحت ' یک قطبی دنیا (uni-polar world) کی تشکیل اور اس پر کامل اختیار اور حاکمیت کے حصول کے لیے باقاعدہ نے فکری تناظر، مباحث، فلسفے، اصول، ضابطے، ادارے اور پیرا میٹرز قائم کیے جا چکے تھے۔ چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی وسائلِ پیداوار کی بندر بانٹ میں کیپٹل ازم اور سوشل ازم کے درمیان جہاں بہت سے اصولی معاشی، سیاسی اور انتظامی بندوبست (adjustments) کیے گئے تھے، وہاں بعض فکری اور فلسفیانہ موشگافیوں کے سلسلے بھی شروع ہوئے اور اس طرح ما بعدیت کی دنیا وجود میں آئی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ دو متحارب طاقتوں کے درمیان ہونے والی تبدیلی کو زیادہ تیز نہ ہونے دیا جائے اور انسانی تہذیب کی حاصل کردہ بہت سی فتوحات کا کھلے عام بطلان کیا جائے۔ بیسویں صدی کے آخری عشروں پر محیط سرد جنگ کے دوران مغربی کیپٹل ازم کو غیر معمولی برتری حاصل تھی۔ چنانچہ نتائج بھی اس کے حق میں ہی نکلے۔ سائنس ٹیکنالوجی، معلوماتی وسائل اور ارتکازِ دولت کے ذرائع پر بلاشرکتِ غیرے امریکی گرفت کو اسی دور میں غیر معمولی وسعت، استحکام اور فوقیت حاصل ہوئی۔ جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ سوشلسٹ ورلڈ کی شکست و ریخت اس مقابلے کا آخری walk over تھا جو بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مکمل ہو گیا تھا۔ اس پوری مدت میں امریکی دانش گاہوں اور ان سے وابستہ اداروں میں فیوچر شاک (۱۹۷۰ء)، دی تھرڈ ویو (۱۹۸۰ء)، پاور شفٹ (۱۹۹۲ء)، تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی (۱۹۹۲ء)، تہذیبوں کا تصادم (۱۹۹۳ء)، تھرڈ ورلڈ سولائزیشن ان گلوبل کیپٹل ازم (۱۹۹۳ء)، دی سمبا ازم آف ایول، روٹس آف ایول، دی ہولوکاسٹ جیسے بے شمار مباحث اور کتابیں پیش کی گئیں جن کے توسط سے ایک ایسی فکری تحریک چلائی گئی۔ جس کا مقصد عالمی وسائل کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تابع کر کے کیپٹل ازم کے نمائندہ اداروں کے زیرِ نگیں کرنا تھا جو امپیریل ازم کی جدید ترین شکل تھی اور عملاً ایک ایسا معاشی اور سیاسی نظام تخلیق کیا گیا جس میں صرف اور صرف ڈالر کی حکمرانی ہو اور اس نظامِ نو میں امریکا اور اس کے حلقہ بگوش چند ملکوں کے سوا تھرڈ ورلڈ یعنی ایشیا اور افریقہ کے کم و بیش ان سب ملکوں کو آؤٹ سائیڈر قرار دے دیا گیا۔ جنھوں نے امریکا کی حاکمیت پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کرنے میں تساہل کا مظاہرہ کیا۔ ان فکری اور فلسفیانہ مباحث میں سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے دنیا کی مختلف تہذیبوں کے درمیان تصادم کے مسئلے کو بنیاد بنا کر مختلف مذاہب اور شناختوں کو نئی دنیا کے لیے ایک ایسا چیلنج قرار دیا ہے۔ جس سے جلد از

جلد نبرد آزما ہوئے بغیر 'نیو ورلڈ آرڈر' کی کامیابی مشکوک رہے گی۔ اسی فکری ڈسکورس کی ابتدا سیموئیل پی ہننگٹن سے قبل برنارڈ لیوس جنھیں بش ایڈمنسٹریشن میں مشرقی قوموں کے مسائل پر اتھارٹی سمجھا جاتا تھا، شروع کیا تھا اور جس نے پہلی مرتبہ Good Muslim اور Bad Muslim کا تصور پیش کر کے ان مجاہدوں کی سرپرستی کرنے کا جواز پیش کیا تھا جنھیں دنیا بھر سے جمع کر کے افغانستان سے روس کو نکال پھینکنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور روس کی شکست کے بعد ان ہزاروں جنگ جو مجاہدین کو افغانستان کی سنگلاخ سرزمین پہ بے نیلِ مرام چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ سارے معاملات ۹/۱۱ کے 'ماقبل' ہی کے ذیل میں آتے ہیں جن سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۹/۱۱ کے زیرِ اثر جو ناول اور افسانہ لکھا گیا ہے، ان میں 'ماقبل' تناظر بھی کسی نہ کسی انداز میں در آیا ہے۔ اس موضوع میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے 'نان فکشنل' کتابوں پر بھی نگاہ ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس الم ناک سانحے سے چند برس پہلے اور بعد میں لکھی گئی ہیں، خاص طور پر خود سیموئیل پی ہننگٹن کی کتاب "Who Are We: America's Great Debate" کی کتاب ہے جو ۹/۱۱ کے بعد شائع ہوئی اور جس میں تاریخی تناظر اور معروضی حقائق کی روشنی میں امریکا کے تشخص کے خطوط کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے بزرگ بانیوں کی اینگلو سیکسن میراث — انگریزی زبان — پروٹسٹنٹ کرسچین تصورات اور امریکن تشخص کو خصوصی فوقیت دی گئی ہے۔ صرف امریکن تشخص (Creed) کی اصطلاح ایسی ہے جسے گزشتہ دو سو برسوں میں نو بہ نو معنی پہنائے جاتے رہے ہیں اور یہی وہ کھونٹی ہے جس پہ امریکی حاکمیت اپنی قبائیں ٹانگتی رہی ہے کہ جب ضرور ہو، حسبِ ضرورت ملبوس منتخب کر کے زیبِ تن فرماتی رہے۔

نجیبہ عارف

ادب کا نومزاحمتی رجحان

پاکستانی اُردو افسانے پر ۱۱/۹ کے اثرات

تاریخ کتنے ہی ایسے اہم واقعات سے بھری پڑی ہے جن کا وقوع دنیا کو زیروزبر کر دیتا ہے، سود و زیاں کے پیمانے اور خیر و شر کی میزان بدل جاتی ہے اور زندگی خود کو ایک نئے آئینے میں دیکھنے لگتی ہے۔ اس نئے آئینے میں خود کو پہچاننے، اپنے بھولے ہوئے یا بگڑے ہوئے خال و خد کو نئے سرے سے تراشنے میں بعض اوقات صدیاں گزر جاتی ہیں۔ وقت کی دھول بیٹھتے بیٹھتے بیٹھتی ہے۔ تاریخ کا دھارا مڑتا ہے تو دور تک کف اڑاتا چلا جاتا ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اس جھاگ جھاگ تحیر میں نہ تیر سکتے ہیں، نہ ڈوب پاتے ہیں۔ گیارہ ستمبر، مابعد کی دنیا میں اٹھنے والی ایک ایسی ہی منہ زور موج تھی جس کی دھند ابھی تک وقت کے آفاق پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے اس دنیا کو مابعد کی دنیا اس لیے کہا ہے کہ گیارہ ستمبر سے پہلے بھی اس کی فضا پر ایک بے نامی، ایک بے چہرگی اور بے مقامی سی چھائی ہوئی تھی۔ فکر و فلسفے کی دنیا میں اس عہد کا کوئی نام نہیں۔ کوئی فکری، ادبی یا فلسفیانہ تحریک ایسی نہیں جسے اس دنیا کی پہچان قرار دیا جا سکے۔ یہ اپنے ماضی کے حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم، پوسٹ ہیومن ازم، پوسٹ سٹرکچرل ازم، پوسٹ کولونیل ازم، پوسٹ مارکس ازم، پوسٹ فیمین ازم۔۔۔ اس عہد کا ہر فکری واقعہ، کسی نہ کسی گزشتہ واقعے کا عکس، ردعمل یا توسیع ہے اور اس عہد نے اپنے لیے کوئی نام، کوئی سرنامہ مقرر نہیں کیا ہے۔ یہ مابعد کی دنیا ہے۔ مابعد کی حدود و قیود ہمیشہ نامعلوم ہوتی ہیں کیوں کہ بعد کا تجربہ کرنے کے بعد مابعد، مابعد نہیں رہتا، ماقبل بن جاتا ہے۔

مابعد کی اس دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، دراصل دو خلاؤں کی تشکیل ہے۔ ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔ یہ بات بش اور اوباما کی تقاریر سے لے کر، اسکول کے بچوں کے مباحثے تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ

ستمبر کا دن عہدِ جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے، جب پرانی جمی جمائی زندگی کی بساط الٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس الٹی ہوئی بساط کو، اس نئے رشتے کے پیچ وخم کو ہر ایک نے اپنے اپنے فکری، تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ایک تناظر تو یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے جس تصادم کی خبر، صاحبانِ خرد گزشتہ دو دہائیوں سے دے رہے تھے، اس کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ اہلِ مغرب کو نوید ہو کہ اب وہ اپنی فکری توانائیوں کو اہلِ مشرق، بالخصوص اہلِ اسلام کے بحرِ ظلمات میں اجالا پھیلانے میں صرف کر سکیں گے۔ دوسرا تناظر اہلِ اسلام کا ہے جنھیں بشارت ہے کہ آخری فتح، جس کا وعدہ تھا، ملنے ہی والی ہے اور کفر کے ظلمت کدے میں نورِ اسلام کا اجالا پھیلانے کا وقت قریب ہے۔ تیسرا تناظر کولمبس کے دریافت کردہ خطے میں پروان چڑھنے والی نسلوں کے اس مخصوص طرزِ فکر کا ہے جس کے مطابق امریکہ ایک ملک ہی نہیں، ایک دستورِ حیات اور طرزِ زیست کا بھی نام ہے۔ اس ملک کی ایک تو جغرافیائی حدود ہیں اور دوسری ثقافتی، معاشرتی اور اقداری حدود ہیں۔ ان ثقافتی حدود سے باہر زندگی بسر کرنے والے لوگ امریکیوں کے لیے ''غیر'' (others) ہیں۔ ان کی اپنی سرزمین پر ''غیروں'' کی اس کارروائی نے انھیں دم بخود کر دیا ہے اور انھیں اپنے خول کی ناتوانی کا احساس مسلسل کچوکے لگا رہا ہے۔ چوتھا تناظر تیسری دنیا کی ان کمزور، ناخواندہ، منتشر اور پس ماندہ اقوام کا ہے جنھیں نہ چت اپنی لگتی ہے نہ پٹ۔ انتہائی بے بس اور بے عمل ہونے کے باوجود وہ محسوس کر سکتی ہیں کہ دنیا کا نظام ٹھیک طریقے سے نہیں چل رہا۔ وہ تمام بڑی بڑی اصطلاحات، نظریات اور علوم وفنون سے ناواقف سہی، مگر اپنے کرب والم کے شعور سے بے بہرہ نہیں، ان کے لیے گیارہ ستمبر کا دن ایک نیا پیغام چھوڑ گیا ہے۔ ایک تناظر ان دو تین مخصوص ممالک کے عوام کا بھی ہے، جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے کوسوں دور واقع ہیں، جن کا کوئی براہِ راست تعلق اس واقعے سے ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا مگر اس کے نتائج کا سب سے ہول ناک اثر ان کی زندگی پر ہوا۔ ان میں ابھی تک عراق، افغانستان اور پاکستان شامل ہیں۔ ایران کب سینہ چاکانِ چمن سے آملے، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان بہر طور پہلے دن سے اس کا حصہ یا نشانہ رہا ہے۔

اس مقالے میں اس آخری تناظر کا اردو ادب کے حوالے سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مغرب، بالخصوص امریکہ میں اس موضوع پر خاصی تحقیق ہو چکی ہے اور گیارہ ستمبر کے اثرات کا ادبی، لسانی، عمرانی، سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ کئی ناول اور نظمیں لکھی گئیں،

دستاویزی اور فیچر فلمیں بنیں، موسیقی، مصوری اور کومکس کے ذریعے اسے دیکھنے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئی، اور انسانی زندگی پر اس واقعے نے جو گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ان کا تجزیہ کیا گیا۔ ایسی تمام تخلیقات کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں، لیکن چند ایک ناولوں کا مختصر سا ذکر کرنا یوں مناسب ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ جس سرزمین پر یہ واقعہ رونما ہوا ہے، اس پر بسنے والے لوگوں نے خود اسے کس نظر سے دیکھا اور محسوس کیا ہے؟

امریکہ میں لکھے جانے والے ان ناولوں میں عام طور پر انفرادی صدمات و حادثات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے آس پاس، نیویارک میں رہنے والے افراد کس طور اس حادثے سے متاثر ہوئے، ان کی نجی زندگیوں میں کیا انقلاب آئے، ان کے ذاتی خواب اور منصوبے کس طرح متاثر ہوئے اور انھیں کس طور پر اس حادثے کے مابعد اثرات سے نپٹنا پڑا۔ عام طور پر انگریزی فکشن نے گیارہ ستمبر کے اثرات کو اسی سطح پر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ کین کیلفس (Ken Kalfus) کے ناول، A Disorder, Peculiar to the Country [1] میں، طلاق پر آمادہ ایک، شادی شدہ جوڑے کی باہمی نفرت اور عداوت کو گیارہ ستمبر کے پس منظر میں بیان اور اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ان کی زندگی میں ایک امکان بن کر رونما ہوتا ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کو مردہ سمجھ کر ایک مخفی اور گہرا، مگر احساسِ جرم سے آلودہ، اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ لیکن دونوں بالآخر اس حادثے میں بچ نکلتے ہیں اور بعدازاں پھر سے ایک دوسرے کو آزار پہنچانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ناول میں بیان کردہ تفاصیل عالمی عصری حقائق کے تناظر میں ابھرتی ہیں۔ ان کی ناکام شادی اور ایک دوسرے سے قطع تعلق کی خواہش، بیوی جوائس کا افغان جنگ میں دلچسپی لینا، شوہر مارشل کا بم بنانے کا تجربہ کرنا اور اسرائیلی جبر کے سامنے امریکی حکومت کی بے بسی پر تبصرہ کرنا، اسامہ بن لادن کی گرفتاری، عراق اور افغانستان کی جنگیں، تہذیبی تصادم، خودکش بموں کی تیاری اور ایسے ہی کئی دیگر عوامل ہماس نئی صورت حال کا بیانیہ ہیں جو گیارہ ستمبر کے بعد امریکی زندگی کا حصہ بنی ہے۔ مجموعی طور پر اس ناول میں بش کے دورِ حکومت میں امریکی طرزِ حیات کی کم عیاری پر طنز ملتا ہے جسے مزاح کا روپ دیا گیا ہے اور نقادوں نے اسے کامیڈی آف مینرز قرار دیا ہے۔ [2] ازدواجی زندگی کی ناکامی اور دو انسانوں کے درمیان عدم برداشت اور ناموافقت اس بڑے دائرے کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے جس میں قومیں، قوموں سے برسرِ پیکار ہیں اور نظریات نظریات سے تصادم کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس الم انگیز صورتِ حال سے جو بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے، وہ محض دو انسانوں کی زندگیوں کو نہیں،

بلکہ مجموعی طور پر تمام بنی نوعِ انسان کو متاثر کرتا ہے۔ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دینے کی حیوانی خواہش اور اس میں ناکامی؛ کیوں کہ فطرت کے قوانین کسی اور طرح سے عمل پیرا ہوتے ہیں، انسانوں کو کس طرح رنج و محن کا شکار رکھتی ہے۔ ناول نگار نے دو افراد کے نجی المیے کو ایک بڑے اور وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے تاہم یہ تناظر ناول کے بیانیے میں محض علامتی طور پر موجود ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اس قریبی مگر نفرت و عداوت پر مبنی رشتے کی رمزیت، مشرق و مغرب کے درمیان ابھرتی اور پھیلتی ہوئی خلیج، اور سیاست کے بطون میں ایک دوسرے کی تباہی بلکہ مکمل فنا کی خفیہ آرزو کے پروان چڑھنے کی حقیقت کو عیاں کرتی ہے۔ مگر یہ دونوں قوتیں مسلسل برسر پیکار رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو نابود کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ تاریخ کا سبق بھی یہی ہے کہ صدیوں کی جدوجہد اور مبارزت کے باوجود قومیں، قوموں کو نابود نہیں کر سکتیں۔

ایسا ہی ایک علامتی تناظر ڈان ڈیلیلو (Don Delillo) کے ایوارڈ یافتہ ناول[3] *The Falling Man*[4] میں نمایاں ہوتا ہے۔ *Falling Man* رچرڈ ڈریو[5] کی کھینچی ہوئی، انتہائی معروف ہونے والی، ایک تصویر کا عنوان ہے جو گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی بلند و بالا عمارت سے گرتے ہوئے آدمی کی ہے۔ بعد میں ایک سٹنٹ اداکار نے اس منظر کو نیویارک شہر میں کئی بار پیش کیا۔ وہ خود کو رسیوں سے باندھ کر کسی بلند و بالا عمارت سے گرا دیتا اور یوں اس تصویر کو ایک طرح سے جی کر دکھاتا۔ اس عنوان سے ایک کہانی بھی لکھی گئی ہے اور اس پر ایک دستاویزی فلم[6] بھی بن چکی ہے۔ ڈیلیلو نے اپنے ناول کا عنوان اسی تصویر سے لیا ہے اور یہ عنوان ایک طرح سے ناول کی تھیم کا اشاریہ ہے۔ یہ ایک طرف تو انسان کا انفرادی سطح پر موت یا تباہی کی طرف سفر ہے، اور دوسری طرف اس کے اجتماعی زوال کا اشارہ ہے۔ ناول کا مرکزی کردار، ۳۹ سالہ قانون دان کیتھ ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے میں بال بال بچتا ہے اور زخمی اور ہراساں، ہاتھ میں کسی اجنبی خاتون کا بریف کیس تھامے اپنی علیحدہ ہو جانے والی بیوی کے فلیٹ میں داخل ہوتا ہے۔ یہیں سے، نہ صرف اس کی بلکہ اس کے گرد و پیش موجود تمام لوگوں کی، زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ کیتھ، بریف کیس کی مالک اجنبی خاتون کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے کیوں کہ دونوں اس حادثے میں بچ جانے کے مشترک تجربے سے گزرنے کے بعد خود کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرتے ہیں۔ اس کی بیوی لیانا، مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں زود حسی اور غیظ و غضب کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسے ہر چیز میں اسلام کے اثرات نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ پوسٹ کارڈ اور پڑوسیوں کے گھر بجنے والی موسیقی میں بھی مشرقِ

وسطی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ شہر میں بار بار Falling Man کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ آخر وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی ماں اپنے اس مرد دوست سے قطع تعلق کر لیتی ہے، جس سے اس کی رفاقت بیس سال پر محیط تھی کیوں کہ اس دوست کا تعلق ماضی میں جرمنی کے کسی ''دہشت گرد'' گروہ سے تھا۔ کیتھ اور لیانا کا بیٹا دوربین سے ایک نیا کھیل کھیلنا سیکھ لیتا ہے جس میں وہ آسمان پر جہازوں کو دوربین سے دیکھتا اور ''بل لاڈن'' (بن لادن) کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ آخر کیتھ قانون کا پیشہ ترک کر کے پوکر کا کھلاڑی بن جاتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی ایک انقلاب سے دوچار ہوتی ہے۔ ایک نئی حقیقت کی آگاہی تمام کرداروں کے نقطۂ نظر میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ اسی ناول میں ایک کردار خلیج کا نوجوان حماد بھی ہے جو موت سے نہیں ڈرتا بلکہ اس کی آرزو رکھتا ہے اور اسی آرزو کو اپنی سب سے بڑی طاقت قرار دیتا ہے۔ لیکن خود سے اس کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا زندگی میں کچھ کر گزرنے کے لیے جان سے گزرنا لازم ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ ان جہازوں میں سے ایک کے اغوا کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے جو گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرائے تھے۔ ناول کا اختتام ان جہازوں کے ٹکرانے کے بعد ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی آگ اور دھوئیں میں لپٹی ہوئی عمارت میں ہوتا ہے جہاں کیتھ کے زخمی ہونے اور بالآخر بچائے جانے کی تفاصیل، دوستوں اور ہم کاروں کو مرتے ہوئے دیکھنے کا تجربہ اور ان لمحات کی تصویر کشی ملتی ہے اور یہ واقعہ ایک زندہ تجربے کی طرح قاری کے شعور سے چپکا رہ جاتا ہے۔ یہ ناول قاری کے دل و دماغ میں ایک بھیانک خلا پیدا کرتا ہے اور اثباتِ ہستی کو تشکیک کے گہرے کنویں میں دھکیل دیتا ہے۔

تاہم یہ امر قابلِ غور ہے کہ گیارہ ستمبر کے حوالے سے لکھے جانے والے اکثر امریکی ناولوں کی کہانی شوہر اور بیوی کے درمیان ناموافقت، ناآسودگی، بیزاری اور عداوت کے گرد گھومتی ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے یا اس رشتے کے درمیان کشش و گریز کی قوتوں کو کسی بین الاقوامی سیاسی اور معاشرتی صورت حال کا اشاریہ سمجھا جانا چاہیے؟ کیا انسان اپنے زوال کے سفر میں اپنے زوج سے بیگانگی اختیار کر لیتا ہے یا پھر یہی امراس کے زوال کا سبب بن جاتا ہے؟ اس سوال کو اگر مشرق و مغرب کے تناظر میں دیکھا جائے تو معاصر صورت حال کی کئی جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا مشرق و مغرب ٹھوس جغرافیائی حقیقتیں ہیں یا وقت کا پیدا کردہ ایک التباس؟ اور دوسری طرف یہ خیال آتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے زوج اور اک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سچائیاں ہیں یا ایک دوسرے کی ضد اور باہم متحارب و متخالف قوتیں؟ اور اسی سوال کے بطن سے یہ اندیشہ سر اٹھاتا ہے

کہ ایک کا دوسرے کے خلاف صف آرا ہونا، خود اس کروی وجود پر کیا اثرات مرتب کرے گا جو اپنا اظہار انھی دونوں منطقوں کی مدد سے کر پاتا ہے، اور اس مکانیت میں رونما ہونے والی زندگی کی آئندہ شکلیں اس سے کس طور پر متاثر ہوں گی۔

اونیل (O'Neill) نے اپنے[۷] ایوارڈ یافتہ ناول Netherland[۸] میں زندگی کو ٹیسٹ کرکٹ سے تشبیہ دی ہے جس میں پانچ دن تک کھیل جاری رہتا ہے اور ہار جیت کے فیصلے کے بغیر بھی ختم ہو سکتا ہے۔[۹] کرکٹ کا کھیل اس ناول میں اساسی علامتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو مرکزی دھارے سے ہٹ کر سماجی زندگی کے حاشیے پر جینے والوں کی نفسیات، تہذیبی اجنبیت کے تکلیف دہ احساس اور مغائرت کے تجربے کا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ یہ ناول بھی ایک ناآسودہ جوڑے کی زندگی کے تین سال کا بیان ہے جنھیں گیارہ ستمبر کے بعد کے عدم تحفظ اور بش حکومت کی کوتاہ نظری کے باعث پیدا ہونے والے اضطراب وانتشار کے نتائج بھگتنا پڑے۔ سماجی سطح پر اس واقعے کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور افراد کی خانگی زندگی، ان سے جس طور متاثر ہوئی، اس کا بیان ناول کی کلیدی تھیم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں نیویارک کی زندگی کی مختلف لہروں اور دائروں کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ نقل مکانی کر کے امریکہ میں بسنے والی مختلف قوموں کے افراد کس طرح ایک ضمنی کلچر کی تشکیل کرتے اور باہمی اختلافات پر قابو پا کر ایک مشترکہ گروہ کی صورت اختیار کرتے ہیں اور امریکی کلچر کے بالمقابل اپنا الگ تشخص اجاگر کرتے ہیں، اونیل نے کرکٹ کی علامت کے ذریعے مہاجرت کی اس تھیم کو کامیابی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کے کرداروں کے شب وروز کی منظر کشی یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ گیارہ ستمبر کے بعد نیویارک کی تہذیبی زندگی میں سیاسی مباحث کس طرح اہمیت کے حامل ہوتے گئے یہاں تک کہ سماجی تقریبات اور ڈنر پارٹیوں میں بھی مقامی اور بین الاقوامی سیاست کے امور کا زیر بحث آنا لازم سمجھا جانے لگا۔ دنیا اس واقعے کے بعد کیوں کر ایک نئی نہج پر چل نکلی اور شعوری اور غیر شعوری سطح پر افراد اور معاشرے میں کیا کیا تبدیلیاں نمودار ہوئیں، اونیل نے بڑے فن کارانہ انداز اور مسحور کن زبان میں اس امر کا تخلیقی انداز میں جائزہ لیا ہے۔

زندگی کے بے شکل پھیلاؤ میں ترتیب و تنظیم اور معنی خیز اشکال کی تلاش، تاریخی شعور کا تجزیہ اور اجتماعی یادداشت میں محفوظ ماضی کی نئے سرے سے بازیافت ولیم گبسن (William Gibson) کے ناول، *Pattern Recognition*[۱۰] کا موضوع ہے۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ اس ناول کے مرکزی خیال کے لیے اساسی رمزیت کا کام دیتا ہے جو ماضی کی گمشدگی کا دور تشکیل دیتا ہے۔

مرکزی کردار کے والد کا اس حادثے میں گم ہو جانا ایک طرح سے بیسویں صدی کے گم ہو جانے کا اعلان ہے۔ وقت اب کبھی ویسا نہیں رہے گا جیسا اس حادثے سے پہلے تھا، زندگی کا رُخ ہمیشہ کے لیے بدل گیا ہے اور اب نئے سرے سے معنی کی تلاش کا عمل شروع کرنا ہوگا۔ جڑوں سے کٹ جانے کے بعد دوبارہ جڑوں کی شناخت کی تگ ودو، زندگی کے مابعد جدید دور میں ایک نئے فکری ڈھانچے کی تشکیل اور ترجیحات وتعینات کا ازسرنو جائزہ لینا اس بدلتے ہوئے وقت کا پہلا سوال ہے۔ مستقبل اس دور کو کس نظر سے دیکھے گا، تخلیقیت اور روایت کا تصادم کیا نتائج پیدا کرے گا، تاریخ کے مطالعہ کے کتنے منہاج ممکن ہیں، ان تمام پس ساختیاتی اور مابعد جدید فکری رویوں کا اظہار اس ناول میں موجود ہے اور گیارہ ستمبر اپنی پس منظری حیثیت کے باوجود انتہائی گہری معنویت کا حامل ہے۔

جان اپڈائک (John Updike)(۱۹۳۲۔۲۰۰۹ء) کا ناول *Terrorist*[۱۱] اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس کا موضوع گیارہ ستمبر سے متاثر ہونے والی امریکی زندگی نہیں بلکہ ایک نوجوان مسلم جہادی دہشت گرد ہے۔ اپڈائک ایک معروف امریکی فکشن نگار، شاعر اور نقاد تھے جن کے بیس سے زیادہ ناول اور درجن بھر افسانوی اور شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں بیسویں صدی کا معروف ترین امریکی ادیب کہا جاتا ہے۔[۱۲] ان کی اہم ترین تصنیف Rabbit Series ہے جس کے پانچ ناول شائع ہوئے ہیں۔[۱۳] *Terrorist* ایک اٹھارہ سالہ امریکی، مسلم نوجوان احمد کی کہانی ہے جو ایک آئرش امریکی عورت اور مصری مسلمان کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں کیتھولک ہونے کے باوجود، اپنے سیکولر خیالات کے باعث دین سے بے نیاز ہو چکی ہے اور غیر مردوں سے تعلقات استوار رکھتی ہے۔ احمد اس کی بے دینی اور بے حیائی کے باعث اس سے نفرت کرتا ہے مگر ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی دیکھ بھال کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے۔ ماں کے مقابلے میں اسے اپنے مصری باپ سے زیادہ محبت محسوس ہوتی ہے حالاں کہ وہ اسے تین سال کی عمر میں چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔ اپنے ہم عمروں کی سرگرمیاں اسے قابلِ اعتراض معلوم ہوتی ہیں۔ اسکول میں وہ اپنی دوست کی صنفی کشش کو محسوس کرنے کے باوجود اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ امریکی تہذیب پر مادیت پرستی کا غلبہ اور ثقافت کے نام پر اخلاقی تنزل اسے بالآخر کالج کو خیر باد کہہ کر مسجد میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جہاں امام مسجد شیخ راشد اس کی روحانی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے مگر اس کی قدامت پرستی اسے بیزار کر دیتی ہے۔ آخر وہ ایک لبنانی خاندان کے فرنیچر کے کاروبار کے لیے ٹرک ڈرائیور کا پیشہ اختیار کرتا ہے کیوں کہ شیخ کی تعلیم کے مطابق، رسمی تعلیم کا حصول امریکی بے دینی کی جانب راغب

کرنے اور دین کے بارے میں تشکیک پیدا کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کے اسکول کا قنوطی، یہودی کونسلر، جیک لیوی، جو اگر چہ خود بھی امریکی تہذیب کا شاکی ہے، اسے سمجھاتا بجھاتا ہے مگر ''صراطِ مستقیم'' سے بھٹکنے پر آمادہ نہیں کر پاتا۔ اور آخر کار وہ نام نہاد مسلمان چارلی کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اسے ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے طور پر ملتا ہے لیکن جنسی ترغیبات اور آزاد خیالی کا درس بھی دیتا ہے۔ یہی چارلی اسے دریائے ہڈسن پر واقع لنکن ٹنل پر خودکش حملہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ جیک لیوی کو اس منصوبے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ اس کی خودکش مہم پر روانگی کے وقت اس کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ جاتا ہے اور اسے اس حرکت سے باز رہنے پر قائل کر لیتا ہے۔ وہ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ اس منصوبے کا اصلی خالق، چارلی دراصل کوئی صاحب ایمان مسلمان نہیں بلکہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا اور اسے مذہب کے نام پر استعمال کیا جارہا تھا۔ یوں کہانی میں سیاست کا عمل دخل نمایاں ہوتا ہے اور یہ آخری اشارہ خودکش حملوں کی آڑ میں مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوششوں اور ایسی سرگرمیوں میں امریکی خفیہ ایجنسیوں کے کردار پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ایک معروف امریکی ناول نگار کی جانب سے یہ اشارہ بڑا معنی خیز ہے اور عالمی سیاست کے کئی اسرار و رموز فاش کرتا ہے۔

اس ناول کی کہانی امریکی کم اور پاکستانی یا افغانی کردار کی کہانی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ کہانی کی بنت اور کرداروں کی اٹھان اردو فکشن کے انداز کی ہے۔ مرکزی کردار کی ذہنی کیفیت، کشمکش اور ''بنیاد پرستی''، جن دلائل پر استوار ہوتی ہے وہ بھی پاکستانی معاشرے کے لیے نئے یا اجنبی معلوم نہیں ہوتے۔ امریکی تہذیب کا اخلاقی خلا، کھوکھلا پن اور مادیت پرستی اور اس کے بالمقابل قرآنی تعلیمات جو روحانی سربلندی کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتی ہیں، مفصل بیانیے میں پیش کیے گئے ہیں۔ کہانی اگرچہ دہشت گردی، جہاد، بنیاد پرستی اور قرآنی تعلیمات جیسے موضوعات کے گرد گھومتی ہے مگر اس کا ایک علامتی پیٹرن بھی ہے جو اسلام کے اس مروجہ تصور پر بنیاد رکھتا ہے جو مغرب میں کئی صدیوں سے مقبول رہا ہے۔ مثال کے طور پر احمد کا اپنی کیتھولک ماں سے نفرت اور بیزاری محسوس کرنا حالانکہ اس کی ماں نے تنہا اس کی پرورش کا فریضہ سرانجام دیا ہے اور اپنے مصری باپ کو آئیڈیل تصور کرنا، جو سٹوڈنٹ ایکسچینج پروگرام کے تحت امریکہ آیا، اس کی ماں سے شادی رچائی اور پھر بیوی اور تین سالہ بیٹے کو تنہا چھوڑ کر غائب ہو گیا، اسلام کے روایتی مرد مرکز معاشرتی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں صورت حال خواہ کچھ ہی ہو، مرد کے مقابلے میں عورت ہی کو قصوروار سمجھنے کا رجحان عام ہے۔ مسلمان امام مسجد کا جدید تعلیم کے خلاف وعظ و تبلیغ کرنا کیوں کہ یہ اسلام کے بارے میں شکوک و

شبہات جنم دینے کا باعث بن سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں یہودی جیک لیوی کا احمد کو ''راہِ راست'' پر لانے کی کوشش کرنا، گویا ایک یہودی کا مسلمان نوجوان کی حقیقی رہنمائی کرنا بھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان موجود تناؤ کے تناظر میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد کا مادیت پرستی سے بیزاری محسوس کرنا اور جنت کے حصول کے لیے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی جان لینے کا عمل، جہاں اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں چند مسلمان تنظیموں کے بڑھتے ہوئے متشددانہ رویے کا پتہ دیتا ہے وہاں ان خودساختہ روایات کی یاد بھی دلاتا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد سے مسیحی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مشہور ہوگئی تھیں۔ (اگرچہ جان یپڈائک کا یہ ناول اس ذیل میں نہیں رکھا جاسکتا تاہم امریکہ میں اسلام کی مسخ شدہ تعلیمات سے متعلق سنسنی خیز مواد کی اشاعت ابھی تک جاری ہے جس کی ایک مثال ایرین ولیزاڈا کی تخلیق Passion in the Sand: A Terrorist Romance Novel ہے جو حال ہی میں امریکہ میں شائع ہوا ہے)۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں نوجوان نسل کا ذہنی و روحانی رہنمائی کا متلاشی رہنا اور اس تلاش میں گم راہی میں جا پڑنے کا موضوع مرکزی تھیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ احمد کو تین مختلف افراد کی رہنمائی ملتی ہے۔ شیخ راشد، چارلی اور جیک لیوی جو بالآخر اسے گمراہی کی دلدل سے نکال لیتا ہے۔ ناول نگار نے سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی امریکی سیاسی مہم کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن وہ خود بھی اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں انھی مخصوص تحفظات کا شکار معلوم ہوتے ہیں جو صلیبی جنگوں کے دوران اور بعد یہود و نصاریٰ میں مقبول ہوتے چلے گئے اور جنھیں تقویت پہنچانے میں خود مسلمان ممالک کے عوام الناس، اپنی کم علمی، جذباتیت اور بے عملی کے باعث، کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

Extremely Loud and Incredibly Close[۱۴] جوتھن سیفرون فوئر (Jonathan Safran Foer) کا ناول ہے جس میں ایک نو سالہ لڑکے آسکر کی زندگی پر گیارہ ستمبر کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔ آسکر کے والد اس حادثے میں ہلاک ہوجاتے ہیں اور ان کی موت کے بعد آسکر اور اس کے دادا کی زندگی میں ایک بھیانک خلا پیدا ہوجاتا ہے۔ مصنف نے مابعد جدید دور کے تکنیکی تجربات سے اس ناول میں اظہاری جہات کی گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول گیارہ ستمبر کے بعد لکھے جانے والے کئی اسی نوعیت کے ناولوں میں سے ایک ہے جن میں رقت اور ترحم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسے ناول کئی نقادوں کی تنقید کی نشانہ بھی بنے ہیں۔ مثلاً ڈیوڈ سمپسن (David Simpson) اپنی کتاب *9/11: The*

culture of Commemoration میں کہتے ہیں کہ امریکی قوم نے گیارہ ستمبر کے واقعے سے ایک ماتمی فضا پیدا کر لی ہے اور رقت انگیز، دردناک انداز میں اسے بیان کر کے لوگوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کی عادت ڈال لی ہے۔ وہ اس واقعے کی بنیاد پر قوم کی نفسیات میں ایک ہیجانی کیفیت کے پیدا ہو جانے کو منفی رجحان سمجھتے ہیں۔ امریکی قوم کا خود کو مظلوم سمجھ لینا اور عالم انسانیت کے دکھوں اور مصائب سے بے خبر رہنا اس کی عظمت کا ثبوت نہیں جب کہ دنیا بھر میں عراقی فوجیوں کی ہلاکت اور ابوغریب کی جیل میں قیدیوں پر توڑے جانے والے ہولناک تشدد کے قصے بھی زباں زدِ خاص و عام ہیں۔[۱۵]

محسن حمید (پ: ۱۹۷۱ء) ایک نوجوان پاکستانی ادیب ہیں جنھوں نے زندگی کا کافی حصہ امریکہ میں گزارا ہے۔ اب تک ان کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ The Reluctant Fudamentalist[۱۶] ان کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۷ء میں برطانیہ سے شائع ہوا اور پہلے ناول Moth Smoke (۲۰۰۰ء) کی طرح انتہائی مقبول ہوا۔ یہ ناول مجموعی طور امریکی فکشن کے انداز میں لکھا گیا ہے اور اس میں پاکستان کی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان چنگیز کی زندگی پر گیارہ ستمبر کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے جسے نیویارک میں اپنی کامیاب زندگی اور خوب صورت محبوبہ سے دستبردار ہونا پڑا۔ سیاست کس طرح افراد کی نجی زندگیوں اور خوابوں کو منتشر کر دیتی ہے اور ان کے ذاتی منصوبوں پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ لیکن اس کی اہم ترین بات یہ ہے کہ ناول امریکی نہیں بلکہ دوسرے (other) نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ یہ ایک پاکستانی روشن خیال نوجوان کا نقطۂ نظر ہے، کسی ''بنیاد پرست، متشدد اسلام پسند'' کا نقطۂ نظر نہیں۔ مذہب اس ناول میں کہیں بھی زیرِ بحث نہیں آتا۔ البتہ ناول کا نازک ترین مقام وہ ہے جب مرکزی کردار ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی دیکھتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے جسے وہ بڑی کامیابی سے چھپا لیتا ہے۔ مگر اس مسکراہٹ کا اعتراف ناول کی معنویت میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے اور بین السطور کئی ان کہی کہانیاں بیان کر جاتا ہے۔ ناول کی تکنیک بہت منفرد ہے۔ لاہور کے علاقے انارکلی کے ایک ریستوران میں ایک شام کو ایک بے نام امریکی ایک باریش پاکستانی نوجوان سے ملتا ہے اور پاکستانی نوجوان اسے اپنی یادوں کی دنیا کی سیر کرواتا ہے۔ یہ دنیا امریکہ میں واقع ہے جہاں اس نوجوان کی جوانی کے روشن دن کھو گئے ہیں۔ دوسرے کردار کا کوئی مکالمہ کہانی کا حصہ نہیں بنتا۔ اس کے مکالمات کا اندازہ صرف چنگیز کے ان مکالمات پر ردِعمل سے لگایا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ناول انسانوں کی

زندگیوں کے رنج والم اور نشیب وفراز سے بحث کرتا ہے اور بین السطور یہ پیغام دیتا ہے کہ عالمی بساطِ سیاست پر جو بازی کھیلی جارہی ہے، اس کے نتیجے میں امن پسند، روشن خیال اور معتدل مزاج افراد بھی ایک نوع کی شدت پسندی کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ناول کے دونوں کردار، ایک بے نام امریکی اور ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال پاکستانی جو ''بارلیش'' بھی ہے، اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور کہانی کا عنوان اس کی تفہیم بیان کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ یہ ناول انگریزی میں لکھا گیا ہے اور پہلی بار برطانیہ سے اور بعد میں امریکہ سے بھی شائع ہوا ہے۔ اس حوالے سے اسے مغرب میں تخلیق ہونے والا ادب قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہانی جس مکانی تناظر میں بیان کی جاتی ہے نیز اس کے واحد ناطق کردار کا تشخص اسے پاکستانی ادب کا حصہ بھی بنا دیتا ہے۔

گیارہ ستمبر کا واقعہ امریکی ادب ہی نہیں بلکہ پاکستانی ادب پر بھی خاصی شدت سے اثر انداز ہوا ہے۔ اردو ادب یوں بھی بڑی حد تک سیاسی و معاشرتی تناظر کا عکاس اور مبصر رہا ہے۔ سیاسی و ملکی امور کو موضوع بنانے والے ادیب اور شاعر یا ان کی ایسی تخلیقات جو کسی نہ کسی قومی یا معاشرتی مسئلے سے متعلق ہوں، نسبتاً جلد شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں ذاتی احساسات، انسانی جذبوں اور داخلی کیفیات کا اظہار کرنے والے تخلیق کار زیادہ توجہ کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ یہ صورت حال شاعری میں تو خاصی نمایاں رہی ہے۔ ادیبوں کو ان کی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس قدم قدم پر دلایا جاتا ہے۔ ''مقامی ہوئے بغیر، کوئی آفاقی نہیں ہو سکتا''، ادبی حلقوں اور تقریبات میں کثرت سے استعمال ہونے والا جملہ ہے۔ کلاسیکی دور سے لے کر آج تک ہر شاعر و ادیب کی تخلیقات میں اس کے عہد کے سیاسی، ملکی اور معاشرتی مسائل کا عکس تلاش کرنے کی سعی کی جاتی ہے اور اسی کو اس کے اجتماعی شعور، انسان دوستی اور سماجی آگاہی کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اس بات کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن شاید اہم ترین سبب یہ ہے کہ اردو زبان جس جغرافیائی خطے میں بولی جاتی ہے اور جہاں اس کا ادب لکھا اور پڑھا جاتا ہے، وہاں عوام و خواص سب کے سب کئی صدیوں سے سیاسی انتشار، بے اطمینانی اور معاشرتی جبر و استحصال کا شکار اور اس کے نتیجے میں ختم نہ ہونے والے دکھ درد میں مبتلا رہے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے ان موضوعات کو ادب کا لازمی حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات پر بحث کرنا مقصود نہیں کہ یہ رویہ کس حد تک جائز اور کہاں تک یک رُخا ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جب بھی ملکی سیاست یا معاشرتی زندگی کے

افق پر کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما ہوا ہے، اردو ادیبوں نے اسے اپنی تخلیق کا موضوع ضرور بنایا ہے۔ اگر محض پاکستان کے حوالے سے دیکھیں تو تقسیم کے دوران فسادات، ایوب خان کا مارشل لا، سقوطِ ڈھاکہ، پاک بھارت جنگیں، تحریکِ بحالئ جمہوریت، بھٹو کی پھانسی، ضیأ الحق کا عہدِ حکومت اور اس کے بعد جمہوری حکومتوں کا دور، کسی نہ کسی طرح ادب کا موضوع رہے ہیں اور معروف، کم معروف اور غیر معروف، ہر طرح کے شاعروں اور ادیبوں نے ان پر خامہ فرسائی کی۔ ان میں کچھ تخلیقات تو اعلیٰ ادب کا حصہ سمجھی جاتی ہیں اور کچھ پر ''عوامی ادب'' کا لیبل لگا کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر چہ کسی قوم کے مجموعی مزاج کو سمجھنے اور اس کے حقیقی رخِ نظر کو پرکھنے کے لیے اس ''عوامی ادب'' سے استفادہ بھی انتہائی ضروری ہے۔

اس پس منظر میں گیارہ ستمبر کا واقعہ، جو اگر چہ پاکستان سے کوسوں دور کسی اجنبی سرزمین پر رونما ہوا مگر اپنے عالمی ہمہ گیر اثرات، اور پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی نوعیت اور جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر، پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور شہری زندگی کے امن و سکون پر شدت سے اور منفی طور پر اثر انداز ہوا، اردو فکشن اور شاعری دونوں میں بھرپور طریقے سے رونما ہوا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پاکستان میں واقع نہیں تھا اور ان پر حملہ کرنے والے ملزموں میں سے کوئی بھی پاکستانی ثابت نہیں ہوا۔ ۲۲ جولائی ۲۰۰۴ء کو امریکہ کے نیشنل کمیشن کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق ۱۹ میں سے ۱۵ ہائی جیکروں کا تعلق سعودی عرب سے، دو کا متحدہ عرب امارات سے اور ایک کا لبنان سے تھا جب کہ گروہ کا سرغنہ محمد عطا مصری تھا۔[۱۷] لیکن اس کے باوجود پاکستان کو اس کا خراج دینا پڑا اور اس حملے کے نتائج سے براہ راست متاثر ہونا پڑا۔ اسی کے نتیجے میں پاکستان کے پڑوسی ملک افغانستان پر وحشیانہ بمباری ہوئی جس کا شدید ردِ عمل پاکستان کے مذہبی حلقوں میں پیدا ہوا۔ طالبان کے مسئلے پر قوم دو طبقوں میں تقسیم ہوئی۔ ایک طبقہ اسلام کے روشن خیال پہلو کی حمایت اور طالبان کی انتہا پسندی کی مخالفت پر آمادہ ہوا اور دوسرا طبقہ، منطق و دلیل سے کام لینے کی بجائے اسے کفر و اسلام کی جنگ قرار دے کر عین جہاد قرار دینے لگا۔ جوں جوں امریکہ کے رویے میں تشدد اور سختی بڑھتی گئی، توں توں اس کے ردِ عمل میں شدت اور امریکہ سے نفرت کے جذبات میں تندی پیدا ہوتی گئی۔ عراق پر حملہ اگر چہ پاکستان سے براہ راست متعلق نہیں تھا مگر اسلامی جذبۂ اخوت اور اس کے ساتھ ساتھ عام انسانی ہمدردی کے تحت، اس کا ردِ عمل کئی نظموں اور نثری تحریروں میں نظر آتا ہے۔ بعد میں پرویز مشرف حکومت کے فیصلوں اور پالیسیوں پر امریکی اثرات، لال مسجد کی ڈنڈا بردار لڑکیوں کی

کارروائیاں، اس کے نتیجے میں دارالحکومت کے قلب میں واقع جامعۂ حفصہ پر چڑھائی اور کئی انسانوں کو، جو خود اپنے ہی ملک وقوم سے تعلق بھی رکھتے تھے، زندہ درگور کر دینے کی جرأت آزمائی، بلوچستان میں اکبر بگتی کا قتل، باجوڑ اور سوات کے آپریشن اور ان کے نتیجے میں ملک بھر میں دہشت گردی اور خود کش حملوں کا نا ختم سلسلہ، پاکستان کے ادبی رسائل، اخبارات اور میڈیا پر موضوعِ بحث بنتے رہے۔ خاص طور پر کراچی سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے ''دنیا زاد'' کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اس نے ملکی، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خصوصی شمارے شائع کیے جن میں دنیا بھر میں سامراجی جبر و استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور ان موضوعات کا احاطہ کرنے والی تحریروں کو خصوصی جگہ دی گئی۔ ''فنون'' اور ''نقاط'' نے بھی اس موضوع میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ دیگر ادبی رسائل میں بھی وقتاً فوقتاً ایسی تحریریں شائع ہوتی رہیں جن میں مقامی اور عالمی سیاست کے نشیب و فراز کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی ایک نو مزاحمتی رجحان کا آغاز ہوتا ہے جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر انسانیت کی تذلیل اور تباہی و بربادی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ یہ مزاحمت کسی خاص حکومت، نظریے یا گروہ کے خلاف نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی ہر نوع کے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور مذہبی استحصال کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس مقالے میں اُردو ادب میں گیارہ ستمبر کے اثرات کو محض افسانے کے ذیل میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس حوالے سے اولین نمایاں کوشش مسعود مفتی کا افسانہ ''شناخت'' ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔[18] اس کا موضوع امریکی پاکستانیوں پر گیارہ ستمبر کے واقعے کے غیر متوقع نتائج ہیں جو ان کی کایا کلپ کا سبب بن جاتے ہیں۔ خالد جو امریکی تہذیب و تمدن کا اس قدر دلدادہ ہے کہ مذہب کی گرفت سے بالکل آزاد ہو چکا ہے، جوزفین سے شادی کا محل ایک طرح سے ماضی کے ہر تعلق کی قبر پر تعمیر کرتا ہے۔ ماں باپ، عزیز رشتے دار، تہذیب و تمدن، سماج اور مذہب، غرض ہر زنجیر توڑ کر وہ امریکی طرزِ زیست کو اپنا شعار بناتا اور امریکی روشن خیالی اور آزادروی کو اپنا عقیدہ قرار دیتا ہے۔ خود اپنے بچوں کو بھی وہ یہی ذہنی آزادی دینا چاہتا ہے اس لیے وہ انھیں اپنی پاکستانی اور اسلامی شناخت سے متعارف نہیں کراتا تاکہ وہ بالغ ہو کر خود اپنی مرضی کی راہ اختیار کر سکیں۔ اسی عقیدے کے تحت وہ بنگالی مسلمان مفیض کو ازراہِ تمسخر مولوی کہتا اور حقارت سے دیکھتا ہے جو اس ملک میں بھی اپنی فرسودہ روایات سے چمٹا ہوا ہے اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے۔ سلیم اگرچہ اس کا پرانا دوست اور

جوانی کی رنگین شاموں کا ساتھی ضرور ہے مگر اپنی اسلامی اور پاکستانی شناخت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ دونوں کے درمیان کئی مرتبہ بحث وتکرار بھی ہوئی جو ہمیشہ بے نتیجہ رہی۔ زندگی اسی ڈھب پر چلتے چلتے اچانک ایک زبردست حادثے کا شکار ہو جاتی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد اچانک خالد کا مدتوں سے خوابیدہ، متروک تشخص جیسے بیدار ہونے لگتا ہے۔ اسے خوابوں میں بھوتوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی، اندھیرا گردباد کی طرح گھوم گھوم کر نئے نئے روپ دکھاتا ہے جس میں کبھی صلیبی جنگوں کے مرغولے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی امریکی لیڈروں کے ہیولے۔ قسطنطنیہ اور یروشلم کا سقوط، فریڈرک، رچرڈ اور صلاح الدین کے خدوخال اور ایسے ہی کئی اوہام اس کے ذہن کی سطح سے ٹکراتے ہیں۔ دن کی روشنی میں وہ روشن خیال اور ماڈرن خالد ہی رہتا ہے مگر آہستہ آہستہ رات کا شعور دن کے شعور پر غالب آنے لگتا ہے۔ اسے اچانک اسکول میں پڑھی اردو نظموں کے بھولے بسرے شعر یاد آنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی اسے اپنے متروک کلچر کی لاشعور کی سطح پر بازیافت کا طعنہ دیتی ہے۔ ایک روز مفیض کو پارک میں نماز پڑھتا دیکھ کر چند امریکی بچے اسے ''طالبان'' قرار دے کر اس پر حملہ آور ہونے کی تیاری کرتے ہیں کہ خالد انھیں دیکھ لیتا ہے اور بچوں کو سمجھا بجھا کر بھیج دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نیا احساسِ عدم تحفظ اس کی نفسیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ مفیض کے ذہن میں پاکستانی فوج کے ظلم وستم کی یاد (جو اس افسانے کی ضمنی تھیم کے طور پر نمایاں ہوتی ہے) اسے مفیض کے ساتھ ایک نئے اور عجیب وغریب رشتے میں باندھ دیتی ہے جس کی بنیاد نہ تو خون ہے، نہ کلچر، نہ قومیت۔ خالد کو لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ یہ رشتہ مذہب کی بنیاد پر استوار ہے۔ آہستہ آہستہ اسے اپنے گھر میں دو مختلف مذاہب کی تفریق کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ماضی کی یاد اور اپنے تہذیبی تشخص کا احساس اسے پندرہ برس بعد پاکستان لے جاتے ہیں جہاں اس کے والد کی موت ایک اور چوٹ دیتی ہے۔ امریکہ واپس آنے کے بعد اسے اپنے بچوں کا بائبل کی نظمیں گانا اور ہولی کراس تلے دادا کی تصویر رکھ کر ان کی یاد منانا تکلیف دہ لگنے لگتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کی دلداری اور اس رواداری کے خیال سے، جس کی ساری عمر انھیں تربیت دیتا رہا تھا، انھیں اپنی بدلتی ہوئی کیفیات سے آگاہ نہیں کر پاتا مگر دلی بے چینی اور اضطراب اسے بے بس کر دیتے ہیں اور آخر ایک دن وہ مفیض کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد چل پڑتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے گیارہ ستمبر کے بعد کی صورت حال کو وہ دھچکہ قرار دیا ہے جس سے فلموں میں کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آتی ہے اور اچانک اپنے بچھڑے ہوئے، چھوڑے ہوئے دوست پھر سے آشنا لگنے لگتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کا لو

کیل بھی امریکہ ہی ہے۔ وہی امریکہ جہاں اسی واقعے کو ایک بالکل مختلف تناظر میں بھی دیکھا اور پیش کیا جارہا تھا۔ گیارہ ستمبر کے واقعے کی یہ ایک اور جہت ہے جس کا تجربہ امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو ہی ہوسکتا تھا۔ یہ وہی روایتی اپروچ ہے جو مذہبی حلقے میں خاصی مقبول ثابت ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں ایک مرحلے پر ''مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے'' کی امید پیدا ہونے لگی تھی۔ مسعود مفتی نے اسی مقبول آئیڈیالوجی کو افسانے کی بنت میں پرودیا ہے۔

افتخار نسیم کا افسانہ ''پردیسی''[۱۹] بھی ایسے ہی ایک تجربے کے گرد گھومتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار اسلم اپنی شناخت سے محروم ہے کیوں کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی پیداوار ہے۔ بلوے کے درمیان کوئی شخص اسے پناہ گزینوں کی گراؤنڈ سے اٹھا کر گھر لے آیا اور اس کی بیوی نے اس شیر خوار بچے کی دیکھ بھال کی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بچہ ہندو کی اولاد ہے یا مسلمان کی۔ زندگی بھر وہ اپنی حقیقی شناخت سے محروم کسی پردیسی کی طرح جیتا رہا۔ جب اسے پالنے والے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو بڑے بھائیوں نے اسے اس گھر سے نکال دیا اور وہ امریکہ آ گیا۔ چالیس سال امریکہ میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں بھی پردیسی ہی تھا کیوں کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد امریکہ کا رویہ بھی اس کے بڑے بھائیوں کا سا ہو گیا تھا۔ شکاگو کے ایک ڈرگ سٹور کی پارکنگ میں کسی امریکی کی گالیاں اور Go back to your country کی دھمکی سن کر اسے لگا کہ پوری ''تھرڈ ورلڈ'' ایک یتیم خانہ ہے۔ جہاں رہنے والے سب بچے پیدا ہوتے ہی اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے تھے۔ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ، اس کہانی میں نہایت اہم ہونے کے باوجود اس سے زیادہ کردار ادا نہیں کرتا کہ ایک پہلے سے موجود حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے۔ انسانوں کے درمیان تقسیم کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ کہیں یہ تقسیم ذات پات کی ہے، کہیں خاندان کی، کہیں مذہب اور کہیں جغرافیائی وطنیت کی۔ اس تقسیم نے انسان کو ایک طرف شناخت عطا کی ہے اور دوسری طرف اس سے کرۂ ارض کی مکانیت چھین کر اسے اجنبیت اور بیگانگی کے خول میں لا پھینکا ہے۔ انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے اس کرۂ ارض پر موجود رہنے اور اسے اپنانے کے حق سے محروم ہے۔ اسے اپنا حقِ ملکیت جتانے کے لیے خود کو کسی نہ کسی شناخت کا ماسک پہننا پڑتا ہے۔ یہ شناخت اسے ایک محدود نوعیت کا حق عطا کرتی ہے اور ایک وسیع تر تناظر میں اس حق سے محروم بھی کر دیتی ہے۔ اگر تیسری دنیا میں یہ تقسیم کھلم کھلا اور بانگِ دہل موجود ہے تو پہلی دنیا میں اس کے خوبصورت اور پرفریب نام رکھ دیے گئے ہیں۔ کہانی کی بنیادی تھیم یہی ہے کہ انسانی حقوق کا چیمپئن امریکہ بھی دراصل اسی امتیازی پالیسی پر کاربند ہے جس

پر اس کے بزرجمہر تنقید کرتے رہتے ہیں اور جو انصاف اور مساوات سے کوسوں دور ہے۔ امریکی مسلمانوں اور پاکستانیوں کو اس حقیقت کا ادراک گیارہ ستمبر کے فوراً بعد ہی ہو گیا تھا۔

یوں اردو فکشن میں بڑی حد تک گیارہ ستمبر کے واقعے کا پہلا ردعمل امریکی مسلمانوں یا پاکستانیوں کی صورتِ حال سے متعلق تھا اور یہ بات قابلِ فہم بھی ہے کیوں کہ وہی لوگ تھے جنھیں اس واقعے کا فوری اور ہیجانی ردعمل سہنا پڑا۔ ان کا تجربہ واضح طور پر امریکی فکشن میں پیش کردہ تجربات اور تاثرات سے مختلف ہے۔ اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟ وہ بھی برس ہا برس سے امریکی شہری ہیں، ان کے دل میں بھی دہشت گردی اور اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں، انھوں نے بھی امریکی تہذیب وتمدن کو اپنا دستورِ حیات بنا رکھا ہے، پھر کیا سبب ہے کہ گیارہ ستمبر کا واقعہ رونما ہوتے ہی ان کا شمار ''غیروں'' (others) میں ہونے لگا ہے۔ یہ وہ سوال ہے جو ابتدا میں اردو فکشن میں ببانگِ دہل پوچھا گیا ہے۔ اس سوال کا جواب فکشن میں براہ راست موجود نہیں ہے مگر افسانوں کی اٹھان اس کا واضح جواب پیش کرتی ہے۔ جس طرح ۱۹۴۷ء میں متحدہ ہندوستانی قومیت کے حامیوں کو بھی اپنے علیحدہ تشخص کا یقین آ گیا تھا اور ان کی روشن خیالی اور وسیع النظری دھری کی دھری رہ گئی تھی، اسی طرح امریکی پاکستانی یا مسلمان، امریکی کلچر کے تحفظ کا حلف اٹھانے اور خود اپنے تہذیبی تشخص سے ہر رشتہ توڑ ڈالنے کے باوجود اپنی قومیت سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کوئی عملی مسلمان ہے یا نظری، پاکستان کی تہذیبی روایت سے وابستہ ہے یا امریکی کلچر میں رچا بسا ہے، اس کی گندمی رنگت اور اس کی متروک قومیت ہی بالآخر اس کا تشخص قرار پاتی ہے۔ وہ خود لاکھ اس تشخص سے انکار کرے مگر یہ اس کے ورثے کا جبر ہے جس کا بوجھ اسے بہر حال اٹھانا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اہم واقعے کے کئی دوسرے پہلو بھی فکشن کا موضوع بننے لگے۔ ان میں افغانستان پر وحشیانہ امریکی بمباری اور عراق پر حملے کی فرضی وجوہات سے لے کر، پاکستان میں خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی لہر، شدت پسندی کی رو میں بہتی ہوئی اسلامی شناخت جسے ڈاڑھی اور نقاب سے مخصوص سمجھا جانے لگا ہے، ''جہاد'' پر اکسانے والی تنظیمیں جن کے حقیقی مقاصد پس پردہ ہی رہتے ہیں اور غربت اور افلاس کی دلدل میں دھنستی ہوئی بے اماں مخلوق جسے باعزت جینے کی سبیل ملتی ہے نہ باوقار موت کا آسرا، افسانہ نگاروں کی بھرپور توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

• نیلوفر اقبال کا ''اوپریشن مائیس''[۳۰] گیارہ ستمبر کے بعد امریکی انتقام کی کہانی ہے جس کا ایک

پہلو عراق پر حملے کی صورت میں سامنے آیا۔ کہانی کا مرکزی کردار امریکی فوج کا جنرل مرسی ہے جو اپنے نام اور اپنی قوم کی طرح اپنے سماجی تناظر میں انتہائی رقیق القلب اور نرم دل ہے لیکن رزم سیاست میں بے حد مضبوط اعصاب اور آہنی ارادے کا مالک ہے۔ جنرل مرسی کی کتیا بلیئر کسی مہلک مرض کا شکار ہو جاتی ہے اور اسے انجکشن لگا کر موت کی نیند سلا دینا ناگزیر ٹھہرتا ہے۔ جنرل مرسی کا دل اپنی کتیا کی تکلیف اور اس کی محبت کے شدید احساس سے پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔ اسے پینٹا گون میں ایک اہم میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔ یہ میٹنگ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملوں کے نتیجے میں شروع ہونے والے ''اوپریشن مائیس'' سے متعلق ہے۔ اس آپریشن کا مقصد ان لاکھوں عرب'' چوہوں'' سے نجات حاصل کرنا ہے جو نہ صرف امریکی قوم کے خلاف خوف ناک عزائم رکھتے ہیں بلکہ زمین کے بہت بڑے خزانے کے مالک بھی ہیں۔ انھیں کچل دینے اور ان کے خزانوں کو امریکہ کے تصرف میں لانے کا عزم جنرل مرسی کے ''کسٹرڈ ہارٹ'' کو فولاد میں بدل دیتا ہے۔ افسانہ جنرل مرسی اور اس کی بیوی مارتھا کے درمیان مکالمے سے آگے بڑھتا ہے۔ اس مکالمے میں کہیں کہیں مارتھا کی داخلی کیفیات اور اس کے دل میں ابھرنے والے خیالات بھی کہانی کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔ مارتھا، جو جنرل کی بیوی اور عورت ہونے کے باعث اس سے کم تر ہے، دراصل کہانی کے اصل کردار ''امریکہ'' کا غیر (other) ہے یعنی امریکہ کے مقابلے میں باقی دنیا کی نمائندہ۔ جنرل مرسی امریکہ کے قومی کردار اور اس گہری نفسیاتی کیفیت کا ترجمان ہے جو امریکی تہذیب کی ساختہ ہے اور جس کی رو سے امریکی کردار متضاد رویوں کا مالک نظر آتا ہے۔ اس میں خود پسندی اور ''پالتو جانوروں'' سے گہری محبت ہے لیکن خود غرضی، مفاد پرستی اور طمع نے اسے بے حس، سفاک اور ناانصاف بنا دیا ہے۔ وہ اپنے تضادات سے اس قدر بے خبر ہے کہ جب ٹیلی ویژن پہ اپنے خلاف ہونے والے مظاہرے دیکھتا ہے تو یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ دنیا اس کے رویے کی شاکی کیوں ہے؟ کتیا بلیئر کے علاوہ کہانی کے تین کردار ہیں۔ جنرل مرسی اور مارتھا جسمانی طور پر کہانی کے اندر موجود ہیں، جب کہ بلیئر اور ''چوہوں'' کی موجودگی ان کے تذکرے کی صورت میں محسوس ہوتی ہے۔ جنرل مرسی کی ہمہ دانی اور خود اعتمادی، اس کی خوش مزاجی اور اپنے برحق ہونے کا یقین، اس کی برتری کا احساس دلاتا ہے۔ مارتھا، اس کی بیوی ہے، ایک عورت، جو اگرچہ ''رائٹر'' بھی ہے اور ''ذہین'' بھی، لیکن مرسی کی منطق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ عورت ہونے کے باعث وہ ''جذباتی'' اور ''غیر منطقی'' ہے۔ کم از کم مرسی انتہائی محبت سے اسے یہی احساس دلاتا ہے کہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود وہ پینٹا گون کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ پائے

گی۔ جیسے باقی کی دنیا، امریکہ کا غیر، جو امریکی سیاست کی منطق کو سمجھنے سے محروم ہے اور اس کی پالیسیوں کے خلاف مظاہرے تک کر بیٹھتی ہے۔ مارتھا اپنے شوہر سے اختلاف نہیں کرتی بلکہ اسی کی کھینچی ہوئی لکیر پر چلنے کی مخلصانہ کوشش کرتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کوئی اضطرابی کیفیت بھی جنم لیتی ہے جو اسے احساس دلاتی ہے کہ سبھی کچھ ویسا نہیں جیسا مرسی نے بیان کیا تھا۔ یہ گویا انسان کا اجتماعی ضمیر ہے جو بیداری کے وقفوں میں خود اپنے دماغ سے سوچنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اس پراپیگنڈے کا شکار ہو کر سو جاتا ہے جو غالب قوتوں کا مؤثر ترین حربہ ہے۔ مارتھا، جنرل مرسی کا ''مارتھا ونیارڈز'' (Martha's Vineyards) ہے جو اسے اپنے گھر ہی میں میسر ہے۔ کتیا بلئیر کا نام برطانوی وزیر اعظم کے نام پر رکھا گیا ہے اور امریکی جنرل اس بات پر ایک خفیہ سی تسکین محسوس کرتا ہے۔ بلئیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جنرل کی ''پالتو'' ہے اور ''پالتو جانور سے اپنی اولاد جیسی محبت ہو جاتی ہے۔'' چوتھا کردار چوہوں کا ہے۔ یہ چوہے جو دنیا کے سب سے بڑے خزانے پر قابض ہیں، ریگستانوں میں رہتے ہیں اور ان کا کام صرف ''بریڈ'' (breed) کرنا ہے۔ وہ اتنے بزدل ہیں کہ اپنا روپیہ بھی اپنے بنکوں میں نہیں رکھتے۔ ان کے لیڈر ریکا ؤمال ہیں اور یوں تو یہودیوں سے نفرت کا ڈراما رچاتے ہیں لیکن ''نیوز ویک'' یا ''ٹائم'' کے کور پر آنے کے لیے اپنی روح بھی شیطان کو بیچ سکتے ہیں۔ انھیں ختم کرنے کے لیے جنرل مرسی کے پاس ایسے بم ہیں جن سے ان کا سارا انفرا اسٹرکچر تباہ ہو جائے گا اور جب وہ غیر مسلح اور دہشت زدہ ہو کر بے بس رہ جائیں گے تو پھر جنرل کے منصوبے کے مطابق انھیں ازسرِ نو تعمیر (reconstruct) کیا جائے گا۔ یو این اس مشن کو نہیں روک سکتی کیوں کہ نہ صرف یو این بلکہ ان چوہوں کے لیڈر بھی جنرل مرسی کے ساتھ ہیں۔

یہاں افسانہ نگار نے اپنے کرداروں کے نام اور ان کے مکالموں کے ذریعے گہرے طنز کی کیفیت پیدا کی ہے۔ کہانی فعل ماضی کے صیغے میں بیان کی گئی ہے لیکن حال کا احساس اس کی فضا پر غالب ہے۔ ایہام اور کنائے کی اشاراتی کیفیت کہانی کے زمان و مکان کو محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ اس کا پھیلاؤ حال سے ماضی اور مستقبل دونوں کی طرف دور تک جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف تو Arabian Nights کا اشارہ بغداد کے کسی ماضی بعید کے ہونے کا احساس دلاتا ہے جس کا ہونا اب مشتبہ معلوم ہو رہا ہے اور دوسری طرف دو ٹاورز کے نقصان کے بدلے آئندہ سو سال کی منصوبہ بندی اور کئی سو گنا زیادہ فوائد کی آرزو، کرۂ ارض کے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ''اوپریشن مائس'' اسی منصوبے کا ابتدائی حصہ ہے۔ افسانہ نگار نے بظاہر غیر جانب داری سے دونوں طرف کا نقطۂ

نظر بیان کیا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ دراصل، اس تضاد کو اجاگر کرنا مقصود ہے جو طاقت ور کے ضابطۂ اخلاق میں واضح طور پر جھلکتا ہے اور جسے مبنی بر انصاف ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی منطق اور باطل دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ تاہم دوسری جانب جن کمزوریوں نے اس عمل کو تحریک دی ہے، ان کا ذکر بھی بے باکی اور صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔

نیلوفر اقبال کا دوسرا افسانہ جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، ''سرخ دھبے (اوپریشن مائیس II)'' [۲۱] کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ افسانہ اس اوپریشن مائیس کے اگلے مرحلے کی کہانی ہے جو عراق کی جنگ میں جھونکے گئے دو امریکی نوجوان فوجی افسروں کے درمیان مکالمے اور ایک اختتامی منظر پر مشتمل ہے۔ تکنیک وہی پہلے افسانے کی سی ہے۔ ٹونی اور جیمز عراق میں صدام حسین کے گرائے ہوئے مجسمے کے تھڑے پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں اور جیمز کا ضمیر اسے کچوکے لگا رہا ہے۔ وہ عراق میں پوری طرح آزاد ہیں۔ تہذیب وتمدن کے ہر بندھن سے آزاد۔ جہاں چاہو تھوک دو، piss کر دو، بیئر کین پھینک دو۔ ٹونی اس آزادی کے احساس سے سرشار ہے۔ اسے جیمز کی باتوں پر تعجب ہوتا ہے جو خود اپنی ہی قومی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے حالاں کہ انھی پالیسیوں کی بدولت، تیل کی دولت سے مالا مال عراق پر انھوں نے کتنی آسانی سے قبضہ کر لیا تھا۔ اب امریکہ کا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا، بے روزگاری ختم ہو گی، کام ملے گا، ٹھیکے ملیں گے، تیل کی ساری دولت ملے گی۔ وہ ایک عراقی ریستوران سے فرائیڈ چکن خریدتے ہیں۔ عراقی دکان داران کی ہر کوشش کے باوجود چہرے پر کوئی دوستانہ تاثر لانے سے قاصر ہے۔ ٹونی بے فکری سے چکن پر سرخ سرخ کچپ ڈال کر مزے سے اس کی ہڈیاں تک چوستا ہے اور جیمز کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ انٹیلی جنس کے آدمی ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن جیمز کو بار بار خیال آتا ہے کہ وہ جس مشن پر بھیجے گئے وہ انسان دوست نہیں انسان کش تھا۔ وہ بچے جن کے پورے پورے خاندان بمباری میں مارے جا رہے تھے، محض خیالی کردار نہیں، اصل بچے تھے۔ جن کے اپنے اپنے نام اور خواب تھے۔ امریکی فوجی عراقیوں کے نجات دہندہ نہیں، ان کے قاتل اور درندے تھے۔ امریکی بمباری نے بغداد کا میوزیم اور نیشنل لائبریری تباہ کر ڈالی تھی بالکل اسی طرح جیسے صدیوں پہلے ہلاکو خان نے بغداد کے کتب خانے اجاڑ ڈالے تھے۔ جیمز شرمندہ ہے، اس کی روح مضطرب ہے مگر ٹونی مطمئن ہے۔ وہ ہلاکو خان کی سیاسی بصیرت کا معترف ہے جسے معلوم تھا کہ کسی قوم پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے اسے اس کے ماضی سے کاٹ ڈالنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے ورثے سے محروم ہو کر صرف اور صرف حکمران قوم کے غلبے اور تفوق کو

محسوس کرے۔ جیمز اور ٹونی اسی حکمران قوم کے دو فرد ہیں لیکن ان کی سوچ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ افسانہ نگار یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ طاقت کے بے مہار استعمال پر خود امریکی قوم اندر سے ٹوٹ کر دو فرقوں میں بٹ رہی ہے۔ اس کے اندر سے ردعمل کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ وہ عراقیوں کی ہر نظر، ہر حرکت، ہر کیفیت میں اپنے لیے نفرت محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کی اس خود فریبی کا پردہ چاک ہو چکا ہے کہ وہ عراقیوں کو ظلم و تشدد سے نجات دلانے آئے تھے۔ ان کی اپنی ہمت جواب دے رہی ہے۔ وہ واپس اپنے وطن جانا چاہتے ہیں مگر انھیں دور دور تک اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ رات کے گیارہ بجے تک وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے رنج اور اپنی اپنی امیدیں بیان کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

اگلا منظر جیمز ٹیلی ویژن پر دیکھتا ہے۔ عراقیوں نے فلوجہ کے قریب فوجی گاڑیوں کو آگ لگائی، جلتی ہوئی لاشوں کو گھسیٹ کر سڑک پر نکالا اور ان پر ڈنڈے برسائے اور پھر ایک جلی ہوئی لاش کو گاڑی سے باندھ کر دور تک گھسیٹا۔ یہ لاش جو جلے ہوئے گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہو چکی تھی، اور جس پر خون کے سرخ سرخ دھبے تھے، ٹونی کی تھی۔ بالکل اس فرائیڈ چکن کی طرح جس کے بھنے ہوئے گوشت پر سرخ سرخ کیچپ ڈال کر ٹونی مزے مزے سے کھاتا اور اس کی ہڈیاں تک چوستا رہا تھا۔ فرائیڈ چکن، جو ابتدا میں محض دہن کی لذت کا وسیلہ تھا، اب ایک استعارے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی رمزیت اس وقت پوری طرح واضح ہوتی ہے جب جلی ہوئی لاش کے ساتھ ساتھ چلنے والے ہجوم میں سے کوئی اس منظر پر ''فرائیڈ چکن'' کی پھبتی کستا ہے۔ اس منظر کے بعد جیمز کی خود کلامی اور تمام بیانیہ فالتو اور غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں اور کہانی کے تاثر میں اضافہ کرنے کی بجائے کمی کا باعث بنتے ہیں۔ تاہم کہانی کی تھیم واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ ظلم کی کاشت سے ظلم کی فصل ہی اگ سکتی ہے جو بالآخر ظالم کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کی ہمدردی بظاہر ٹونی پر مرکوز ہے۔ کوئی ایسا لفظ یا جملہ افسانے کے بیانیہ میں موجود نہیں جو عراقی ہجوم کے اقدام کو جائز قرار دیتا ہو۔ بلکہ جیمز کا ٹونی کی یاد میں نوحہ خوانی کرنا اور رقت آمیز انداز میں اس کی زندگی کے خواب دہرانا غالباً اسی لیے کہانی میں شامل کیا گیا ہے کہ افسانہ نگار کی ہجوم کے اقدام کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا سکے لیکن ہر کہانی اپنا ایک آزادانہ تاثر بھی قائم کرتی ہے جو بعض اوقات افسانہ نگار کے شعوری طور پر پیش کیے گئے تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کہانی کا تاثر بھی ہجوم کے وحشت ناک ردعمل کو ایک طرح سے مکافاتِ عمل ثابت کرتا ہے۔ چکن، جس کی ہڈیاں چوس کر پھینک دینا روزمرہ کا ایک

معمول تھا، اچانک، معنویت کی ایک اور تہ کھول دیتا ہے۔ امریکی معاشرے میں چکن کا لفظ ایک طرح سے بزدلی کا طعنہ ہے جسے گالی سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ ٹونی کی لاش پر فرائیڈ چکن کی پھبتی منظر کے ایک خوف ناک امکان کو روشن کر دیتی ہے۔ بعض اوقات بزدلی ہی طاقت بن جاتی ہے اور کمزوری پر قابو پانے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے کیوں کہ حریت کا جذبہ انسان کی وہبی صلاحیت کی مانند ہے اور اسے زیادہ دیر تک مجروح نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں افسانوں کے درمیان ربط پہلے افسانے کے اختتامی جملوں سے بھی پیدا ہوتا ہے جو مارتھا کے دل میں، ریگستان میں جلے ہوئے گوشت اور خون کے دھبوں کے ساتھ ساتھ کسی گم نام فوجی کی بے مقصد موت کے لرزہ خیز خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

''ریئلیٹی شو'' [۲۲] عرفان احمد عرفی کی، حقیقت اور تخیل کی سرحد پر قائم کی جانے والی طلسماتی اور ڈرامائی کیفیت پر مبنی کہانی ہے جس میں آخر دم تک نہیں کھلتا کہ ڈراما کیا ہے اور حقیقت کیا۔ مصنف نے زمان و مکان کا ایک کامیاب التباس پیدا کیا ہے۔ تماشائی یہ خاص الخاص شو دیکھنے کے لیے تھیٹر میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں سخت سیکیورٹی انتظامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سیکورٹی پر مامور افراد تماشائیوں کے موبائل فون اور دھات کی بنی اشیا، چابیاں، بیلٹ، گھڑیاں سب اتار کر الگ رکھتے ہیں۔ سخت تلاشی کے بعد تماشائی اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہیں اور کھیل شروع ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ اعلانات بظاہر ڈرامے کے منتظمین کی جانب سے ہیں مگر خود ڈرامے کے منتظمین مضطرب ہیں کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی ان اعلانات کا محرک نہیں ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ کون تماشائیوں کو ہدایات دے رہا ہے۔ اداکار بھی کشمکش کا شکار ہیں۔ روشنیاں بجھ چکی ہیں، مکمل تاریکی کے عالم میں ہال میں ایک دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بھگدڑ مچنے کو ہے کہ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھماکا ڈرامے کا حصہ تھا۔ تماشائی ڈرامے کو حقیقت سے اتنا قریب دیکھ کر خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے ہیں۔ ڈراما شروع ہو جاتا ہے۔ اداکار اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور دھماکے کے بعد اپنے اپنے عزیزوں کو ٹیلی فون پر اپنی خیریت کی اطلاع دینے لگتے ہیں مگر وہ جس سے بھی بات کرتے ہیں وہ خود اپنی خیریت سے مطلع کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے دوسرے حصوں میں، دوسرے شہروں میں، حتیٰ کہ دوسرے ممالک میں بھی دھماکوں کی آواز سنائی دی گئی ہے۔ اداکار عجیب مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ صورت حال جاننے کے لیے ٹیلی ویژن کا رُخ کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چلانے کے لیے وہ تماشائیوں کی طرف رُخ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور ہاتھ میں پکڑے 'پراپ' کو ریموٹ ظاہر کرتے ہوئے اس کا بٹن دباتے ہیں۔ جوں ہی ریموٹ کا بٹن دبتا ہے، پنڈال کے چاروں جانب دھاتی اشیا کا سراغ لگانے والے آلات

ایک دم چلانے لگتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور بہت سے افراد اسٹیج پر آ کر تینوں اداکاروں کا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔ ''ان افراد کی شکلیں تماشائیوں کے لیے اجنبی نہیں''۔ وہ اداکار کے ہاتھ سے ان کا پراپ چھین لیتے ہیں جسے اس نے ٹیلی ویژن کا ریموٹ بنایا تھا۔ اداکار بھونچکے رہ جاتے ہیں۔ پس پردہ ڈائریکٹر سر تھامے سوچ رہی ہے کہ پراپ میں تو روئی بھری تھی، پھر سیکیورٹی آلات کیسے بول پڑے۔ پنڈال میں تو کسی کے پاس بھی دھات کی بنی کوئی شے موجود نہ تھی۔ اچانک کسی نامعلوم سمت سے کھیل ختم ہونے کا اعلان ہوتا ہے۔ تماشائی کسی نامعلوم خوف کے زیر اثر فوراً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سیکیورٹی پر مامور افراد سے اپنے فون اور دیگر اشیا واپس لیے بغیر خروج کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ یہ راستہ جس کی نشان دہی تیروں کے نشان کر رہے ہیں، اس قدر تنگ، پیچیدہ اور بھول بھلیوں جیسا ہے کہ ہجوم خود کو اسٹیڈیم کے اندر ہی گول گول گھومتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اس بات پر کسی اندرونی خوف کے زیر اثر اشتعال میں آ کر توڑ پھوڑ شروع کر دیتا ہے۔ اس بھگدڑ میں ناقابلِ تلافی جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ مہمان خصوصی کے لیے بچھایا جانے والا ریڈ کارپٹ خون سے اور بھی سرخ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اس بھگدڑ پر قابو پانے کے لیے شہر کی انتظامیہ اسٹیڈیم پہنچتی ہے تو ''وہ'' شخص مائک تھامے اپنے ریئلٹی شو کے آغاز کا اعلان کر رہا تھا جو تھوڑی دیر بعد شروع ہونے والا ہے۔ کہانی تعجب اور اضطراب کے عالم میں ختم ہو جاتی ہے۔ کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔ قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے یا شروع ہونے والا ہے۔ اسٹیج پر جو کچھ رونما ہوا اس میں سے کیا ڈرامے کا حصہ تھا اور کیا حقیقت کا؟ دو مقام ایسے ہیں جن میں مصنف نے کوئی غیر واضح اشارہ دینے کی کوشش کی ہے۔ بھاری بوٹوں والے افراد جو ریموٹ چھین لیتے ہیں، تماشائیوں کے لیے اجنبی نہیں۔ مگر اس سے پہلے ان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ تو کیا یہ وہ افراد ہیں جو تماشائیوں کی سیکیورٹی پر مامور تھے؟ پھر کہانی کے آخر میں جو شخص مائک تھامے ریئلٹی شو کے آغاز کا اعلان کرتا نظر آتا ہے، اس کے لیے مصنف نے ''کسی'' یا ''کوئی'' کی بجائے ''وہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''وہ'' کون ہے، افسانہ نگار کچھ نہیں بتاتا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری سے توقع رکھتا ہے کہ وہ خود بخود اسے پہچان لے گا۔ غالباً یہ وہی شخص ہے جو انتظامیہ کی مرضی اور علم کے بغیر تھیٹر میں اعلانات کرتا رہا ہے۔ ''وہ'' بہرحال کھیل کی انتظامیہ کا نمائندہ نہیں بلکہ ایک طرح سے کھیل کو سبوتاژ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ کہانی کی معنویت کئی سطحوں پر اجاگر ہوتی ہے۔ جمہوری اور فوجی حکومتوں کی کش مکش جس میں جمہوری حکومتیں خود کو بااختیار سمجھتی ہیں لیکن کھیل کی سمت اور رفتار پر فوجی قوت کا

غلبہ رہتا ہے یا تیسری دنیا اور بڑی عالمی قوتوں کی کش مکش، جس میں تیسری دنیا کے حکمران محض کٹھ پتلی ہیں اور ڈوری کہیں اور سے ہلائی جاتی ہے۔ دھماکوں کا مختلف جگہوں پر بیک قت سنا جانا ایک عالم گیر بحران کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہانی کے زمان ومکان کو وسعت عطا کرتا ہے۔ کہانی کا راوی تماشائیوں کے زمان ومکاں میں شریک ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ وہ بیک وقت تماشائیوں، کھیل کی انتظامیہ اور اداکاروں کے ساتھ موجود ہے۔ بھاری بوٹوں والے کے تماشے میں وہ بھی شریک نہیں۔ یہ کہانی براہ راست گیارہ ستمبر کے واقعے پر تبصرہ ہے نہ اس کا تذکرہ کرتی ہے لیکن جو صورت حال پیش کی گئی ہے وہ اس واقعے کے نتائج سے متعلق ہے۔ دھماکے حقیقی تھے یا ڈرامے کا حصہ؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ سیکیورٹی کے نام پر تماشائیوں کے دل میں شدید خوف کا احساس پیدا کیا جانا، محض اتفاق ہے یا سوچی سمجھی اسکیم؟ کہانی کا عنوان بھی ایک التباس پیدا کرتا ہے۔ ''رئیلٹی شو'' ایک ایسے کھیل کو کہتے ہیں جو حقیقت نہ ہو مگر حقیقت دکھائی دے۔ عالمی سیاست کی بساط پر، ذرائع ابلاغ کی مدد سے حقیقت کا التباس پیدا کر کے، اپنے مقاصد حاصل کرنے کی جو سعی کی جا رہی ہے، وہ اس کہانی کی بنیادی تھیم مقرر کرتی ہے۔ تماشائیوں کی بے بسی اور لاعلمی، ان کا اضطراب اور اشتعال کے عالم میں خود ایک دوسرے کو خون میں نہلا دینا اور اس بات سے قطعاً ناواقف رہنا کہ وہ جو کھیل دیکھ رہے ہیں اس میں ڈائریکٹر کی مرضی کتنی ہے اور نامعلوم طاقتیں کس حد تک دخل انداز ہو رہی ہیں، قاری کی دلچسپی کو کہانی میں آخر تک قائم رکھتا ہے اور کہانی ختم ہونے کے بعد اسے ایک بے کنار تجسس میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی تجسس کہانی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ افسانہ نگار نے عصری بدامنی، دھماکوں، تشدد اور دہشت گردی کی فضا کو کسی ایسے ڈرامے سے تعبیر کیا ہے جسے پیش کرنے والے خود بھی بعض اوقات اس کی چال سے لاعلم ہوتے ہیں۔ کوئی نامعلوم طاقت اچانک ڈرامے کے واقعات کا رُخ موڑ دیتی ہے اور بظاہر یوں لگتا ہے جیسے حالات قدرتی انداز میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں جبکہ درپردہ خفیہ طاقتیں برسرِعمل رہتی ہیں۔ کہانی کا پھیلاؤ کسی ایک قوم، ملک یا علاقے کی بجائے بین الاقوامی تعلقات اور سازشوں تک کو محیط ہے۔

خالدہ حسین کا افسانہ ''ابنِ آدم''[۲۳] گیارہ ستمبر کے واقعے کی طرف کوئی براہ راست اشارہ کرتا ہے، نہ کسی خاص زمانی و مکانی صورتِ حال کو واضح کرتا ہے لیکن خودکش دھماکوں، دہشت گردوں اور ان کے عقوبت خانوں کے بیان میں ماضی کے ساتھ ساتھ ہم عصر واقعات کی اذیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ کرداروں کے نام عربی ہونے کے باوجود پاکستانی معاشرت کی بھی یکساں طور پر

نمائندگی کرتے ہیں۔ غالب تاثر تو فلسطین کے مسلمان مجاہدین کا ہے مگر لیلیٰ، ابوحمزہ، قدوس اور امین، کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف ایک بات ایسی ہے جو انھیں فلسطین سے مخصوص کرتی ہے۔ وہ خود کش حملہ آور کسی یونی ورسٹی کے طالب علم ہیں، پاکستان میں ابھی تک یہ رجحان یونی ورسٹیوں اور مغربی تعلیم یافتہ طبقوں میں نہیں پھیلا۔ پھر پاکستان میں ان خود کش حملہ آوروں کے بارے میں ہم دردی کے ایسے جذبات بھی نہیں پائے جاتے جیسے اس افسانے کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حملہ آور جن حالات کے نتیجے میں اپنی جان دینے کا ارادہ کرتے ہیں وہ پاکستان میں بھی اسی شدت سے موجود ہیں۔ عقوبت خانوں میں ان سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ انسانیت کی تذلیل اور ان کے احساسِ آدمیت کو کچلنے کا باعث بنتا ہے اور یہی افسانے کی تھیم ہے۔ طاقت اور اقتدار کا غرور انسان کو کس قدر بے رحم اور شقی القلب بنا دیتا ہے اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی کس طرح انسان کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے اور موت سے بڑھ کر تکلیف دہ عقوبت کا سامنا کرنے کا حوصلہ بخش دیتی ہے۔ خالدہ حسین نے بڑے موثر انداز میں اس موضوع کو بیانیے کی بنت میں اس طرح سمیٹا ہے کہ کسی اضافی جملے یا تبصرے اور راوی کی غیر ضروری مداخلت کے بغیر محض واقعاتی تسلسل اس شدت احساس کا مکمل ابلاغ کر دیتا ہے جو بیانیے کا حقیقی مقصد ہے۔

فرخ ندیم نے اپنے افسانے ''چودھویں رات کی سرچ لائٹ''[۲۴] میں انسانوں کو بھی جانوروں کی طرح ''ہربی وور، کارنی وور اور اومنی وور'' (Herbivore, Carnivore and omnivore) کی خصوصیات سے متصف دکھایا ہے۔ طاقت، تیز رفتاری اور موقع پرستی، یہ تین صفات ہیں جو گوشت خوروں کو مزید تین طبقوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ مٹھی بھر گوشت خور اپنی انھیں صفات کی وجہ سے جنگل کے تمام تر وسائل پر قابض، پنجوں سے گرد اڑاتے، جھاڑیوں پر پیشاب کر کے اپنی طاقت کی مہر لگاتے، گھاس خوروں کا گوشت اپنا حق سمجھ کر کھاتے پھرتے ہیں اور تاریخی ارتقا کو ہمیشہ رنگین رکھتے ہیں۔ دوسری طرف، گھاس خور، محض اپنی گنتی کر کے، بچے پیدا کر کے، ایک دوسرے کے زخموں کو چاٹ کے، اپنی تھکن اتارتے، ایک دوسرے کے سامنے جگالی کرتے اور کسی زلزلے کی آمد تک اپنی مادائوں کی گردنوں پر سر رکھ کر سوئے رہتے ہیں۔ جیسے ہرن، برصغیر کے شاعر جس کی آنکھوں کے قصیدے کہتے نہیں تھکتے، محض اپنی دم پیٹھ پر گھمانے اور مکھیاں اڑانے ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو ارتقا کے دوران فیصلے کی گھڑی میں ہی اپنی شناخت کہیں کھو چکا ہے اور نہ پورا سیاہ ہے نہ سفید۔ بڑے جانور دور ہوں تو ان کا غصہ دیکھنے والا ہوتا ہے، اپنے ہی گرد کھڑی

فصلوں کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں حالاں کہ ان میں اتنی طاقت ہے کہ اگر سارے مل جائیں تو گوشت خوروں کی حکمرانی خطرے میں پڑ جائے۔ بڑی طاقتوں کی اندھی ہوس، تیسری دنیا کے عوام کی بے عملی اور کاہلی، آپس کی رنجشیں، نااتفاقی اور عاقبت نااندیشی عالمی منظرنامے کی صورت حال ترتیب دینے کی ذمہ دار ہے۔ گوشت خوروں اور گھاس خوروں کی علامتی حیثیت تو بالکل واضح ہے لیکن یہ تیسرا طبقہ جو دونوں کی خصوصیات چرا کر اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کر چکا ہے، اپنی حقیقت واضح نہیں کرتا۔ امکان یہ ہے کہ اس سے مصنف کا اشارہ تیسری دنیا کے نااہل، کاسہ لیس، مطلب پرست، خودغرض، اور قوت واقتدار کے حریص، بے رحم حکم رانوں کی طرف ہے جو بیرونی طاقتوں کی مدد سے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور خود اپنے عوام کے حق میں بھوکے بھیڑیے ثابت ہوتے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے رجحان، اسلام کی من مانی تفاسیر اور انھیں زبردستی دوسروں پر ٹھونسنے کے جبری رویے اور تاریخ کو مسخ کر کے اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی مضحکہ خیز کوششوں پر مصطفیٰ کریم نے ''عجائب گھر''[۲۵] میں انتہائی تند و تلخ لہجے میں طنز کیا ہے۔ کرداروں کے نام پاکستان کی تاریخی اور ہم عصر شخصیات کے ناموں کا چربہ ہیں اور فوراً اپنے حقیقی کرداروں کو منکشف کر دیتے ہیں۔ جنرل ٹائیگر، ملا البغاؤں، ملا نحیف، ندرت ہاشمی، جنرل سرمہ، ایٹم بم کے ابا جان، ہشیار خان، یہ تمام نام اپنے تاریخی اور عصری تناظر میں فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اسلام کے نام پر مذہبی گروہوں کی استحصالی مہم جوئی اور فوجی طالع آزماؤں کی وقتی اور عاقبت نا اندیش پالیسیوں کے نتیجے میں جنم لینے والی بدامنی، طالبانائزیشن، عقل و شعور سے بے بہرہ مگر مسلح افراد کی معاشرے کو یرغمال بنانے کی منظم جدوجہد؛ اور روشن خیالی، ترقی پسندی اور زمانے کے تغیرات کا دانش مندانہ طریقے سے تجزیہ کرنے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی بجائے حال کو ماضی سے بدل دینے کے امرِ محال پر اپنی تمام تر توتیں صرف کر دینے کے احمقانہ، نقصان دہ اور خوف ناک طرزِ عمل کو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ اپنے علامتی اور استعاراتی انداز کے باوجود مصنف کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے، واشگاف انداز میں پیش کرتا ہے۔ اسلوب میں طنز و استہزا اور شگفتگی دونوں نمایاں ہیں۔

''لاوقت میں ایک منجمد ساعت'' (عاطف سلیم)[۲۶] ایک امیج کی تشکیل سے شروع ہوتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار خود کو کسی پراسرار مقام پر ایک کھوہ میں موجود پاتا ہے جہاں جنگل کی شوکر، کائی کی دبیز تہیں، کھوہ کے دہانے پر تنتے ہوئے جالے اور ماضی سے کٹ کر گم ہو جانے کی دہشت ہے۔ ہاتھ

میں پکڑے تھیلے میں بچے کے کھلونے اور عورت کا سنگھار اسے اپنی حیثیت کو استوار کرنے میں مدد دیتے ہیں اور وہ شہر کی طرف چل نکلتا ہے جہاں گھروں میں انسانوں کی بجائے ڈر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ روشن دانوں میں اینٹیں چن دی گئی ہیں اور کھڑکیوں میں لکڑی کے ان گھڑ بھدے تختے کیلوں سے ٹھونک دیے گئے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، اپنے آپ میں کھوئے ہوئے، کوک بھرے کھلونے معلوم ہوتے ہیں۔ اچانک ہوائی حملے کے سائرن چلانے لگتے ہیں۔ لوگوں میں سراسیمگی اور دہشت پھیل جاتی ہے اور وہ زیر زمین حفاظتی پناہ گاہوں کی طرف اندھا دھند بھاگتے ہیں۔ تنگ و تاریک تہ خانے کی سیلن زدہ دیواروں سے کان لگائے وہ دیر تک سانس روکے حملوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ''کروز میزائل، کارپٹ بمبنگ، ڈیزی کٹر'' نجانے اس بار آسمان سے کیا برسے گا؟ مگر حملہ نہیں ہوتا اور لوگ اس بات پر بھی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں دشمن انھیں مارنا نہیں چاہتا کیوں کہ انھیں مار کر وہ اپنے غلاموں سے محروم ہو جائے گا۔ وہ صرف انھیں ڈرانا چاہتا ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی ڈر پر قابو نہیں پا سکتے۔ اس کے بعد کہانی مزید علامتی ہو جاتی ہے اور مرکزی کردار شہر کے پر ہول مناظر میں خود کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس تلاش کے دوران وہ اپنے زمان و مکان سے ٹوٹا ہوا رشتہ استوار کرنے کی کئی کوششیں کرتا ہے۔ مگر شہر کسی آدم خور پودے کی طرح اسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیتا ہے اور اسے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ قاری کچھ مانوس اشاروں کی مدد سے اس آسیب زدہ شہر میں وقت کی گم شدگی کا سراغ لگا سکتا ہے۔ ''قلعہ جنگی'' اور ''لمبی داڑھیوں والے خدا پرست'' جو سدا کنواری حوروں کا لالچ دے کر ورغلا لے جاتے ہیں، اس شہر کی بربادی کا اشارہ بن جاتے ہیں۔ افغانستان کی جنگ جس میں پاکستان کے گھروں کے چراغ گل ہو گئے تھے، اور جس نے یہاں کے شہروں کو ڈر اور خوف ہی نہیں، تباہی و بربادی کا تحفہ بھی دیا۔ کرنسی نوٹوں کی جگہ چمڑے کے سکے رائج ہو گئے، ماؤں کی چھاتیاں اپنے شیر خوار بچوں کی بھوک سے بچھڑ گئیں اور کھلے منہ کی قبریں اپنے لاشوں کی منتظر رہنے لگیں۔ بند گلیوں کے اس شہر کی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار لکھتا ہے کہ جس قلمی نسخے سے یہ کہانی نقل کی گئی تھی اس کے اگلے صفحات کسی ''استعمار پسند کرمک'' کی جہنمی بھوک کا شکار ہو گئے ہیں اور ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل بھی گم ہو چکا ہے۔ غالباً یہی استعارہ کہانی کی تھیم بیان کرتا ہے۔ استعماری طاقتوں کی حرص و ہوس تیسری دنیا کے شہروں پر خوف برسا کر انھیں تہ خانوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے اور ان کی زمینوں کی زرخیزی چوس کر انھیں بنجر بنا دیتی ہے۔ جنگل کا اندھا قانون، طاقت کی حکمرانی، عوام کی بے بسی اور بے عملی مل جل کر استحصال کی قوتوں کو مضبوط کرتے

اور زوال کے عمل کو تیز تر کر دیتے ہیں۔

جہادی تنظیموں کے شدت پسندانہ طرزِ عمل اور متوسط طبقے کے ذہنی، فکری، روحانی اور اقتصادی استحصال پر منشا یاد کی کہانی ''ایک سائکلو سٹائل وصیت نامہ''۲۷ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ افلاس اور غربت کس طرح نچلے طبقے کے ایک عام سے لڑکے کی کایا کلپ کر کے اسے انتہا پسند مجاہد میں بدل دیتی ہے، وہ زندگی جس میں نہ کوئی مستقبل ہے نہ کوئی خواب، ایک ایسی امید کے سامنے ہیچ لگنے لگتی ہے جو دنیا کی سب سے عظیم قوت اور مقتدر ہستی کے قرب، خوشنودی اور اس کے نتیجے میں دوامی راحت وعیش کا پیغام لاتی ہے۔ مجاہد بن کر ''شہید'' کے مرتبے پر فائز ہونے والا امین زندگی کے تمام مواقع سے محروم رہنے کے بعد جنت، خدا کی خوشنودی، ہمیشہ کی مسرت اور عشرت کے دامِ فریب میں نہ آئے تو اور کیا کرے۔ اس کے ماحول میں کسی مقتدر ہستی نے اس کی پشت پناہی نہیں کی۔ معاشی بدحالی نے زندگی اور موت کے درمیان فاصلے پہلے ہی کم کر دیے تھے۔ جینے کی آرزو اس کے وصیت نامے کے مضمون میں بین السطور سسکتی ہے، جس کی جھلک اس کے ان پیغامات سے ملتی ہے جو وہ اپنے عزیزوں، جاننے والوں اور دوستوں کو بھجواتا ہے۔ اپنی ماں سے اس کی گہری وابستگی، اپنے اہلِ خانہ کے رنج وکرب کا احساس اور انھیں تسلی دینے کی ہر ممکن کوشش بتاتے ہیں کہ زندگی اور اس کے تمام تر لوازم اسے کس قدر عزیز تھے۔ اگر اسے اسکول میں پڑھنے کا موقع مل سکتا، یا کوئی شہری عزیز اسے نوکری دلوا سکتا تو وہ بھی اپنے طبقے کے دیگر لاکھوں افراد کی طرح معمولاتِ حیات میں جت جاتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کا سارا الزام مولوی سراج الدین کے سر ڈالنا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مولانا سراج الدین کا شکار مولوی محمد شفیع کا لڑکا محمد امین ہی کیوں ہوا۔ خود مولانا سراج بھی کسی کا شکار بنا تھا۔ تو کیا یہ کھیل کسی بڑی سطح پر کھیلا جا رہا ہے؟ کیا اس ڈوری کے آخری سرے پر جو ہاتھ ہیں وہ اس معاشرے کے باہر، کہیں موجود ہیں؟ قومی سیاست کسی عالمی سیاست کا ایک مہرہ ہے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا منشا یاد نے کوئی جواب نہیں دیا مگر ظاہر ہے کہ جب کہیں کوئی سوال اٹھتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس کا جواب بھی ہوتا ہے۔ منشا یاد نے بڑی مہارت سے جواب کو سوال میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ اس وصیت نامے کا سائکلو سٹائل ہونا اسے جو عمومیت عطا کرتا ہے وہ کہانی کی حدود کو بہت دور تک لے جاتا ہے اور یہ صرف محمد امین کی کہانی نہیں رہتی بلکہ ایک عمومی سوال کا مخصوص جواب بن جاتی ہے۔

''مجالِ خواب''، ۲۸ میں ڈاکٹر رشید امجد نے تمثیلی انداز میں تاریخ کے قبرستان کا سفر بیان کیا

ہے جہاں کہانی کا راوی واحد متکلم اپنے مرشد کی ہم راہی میں اپنی جڑوں کی تلاش میں دوسری مرتبہ پہنچتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ ہر کتبے پر عروج و زوال کی داستانیں رقم ہیں اور ساری داستانیں ایک سی ہیں لیکن کسی نے کسی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اس کے تعجب پر مرشد اسے بتاتا ہے کہ عروج ایک نشہ ہے جس میں عقل معطل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک تو کہانی اقوام کے عروج و زوال اور نشیب و فراز کی تفہیم سے جڑی رہتی ہے لیکن اس کے بعد ایک اور قسم کی مابعد الطبیعیاتی فضا میں داخل ہو جاتی ہے۔ عورت، فقیر اور دکان کی حکایت سننے کے بعد کہانی کے راوی کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد سے وقت کہیں غائب ہو گیا ہے، مرشد اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ وقت اور زمانے کا تعلق زندگی سے ہے اور قبرستان میں اس کا کوئی کام نہیں۔ نیز یہ کہ ہر قبر ایک زمانہ ہے اور ہر کتبہ اس زمانے کا چہرہ۔ کہانی کا راوی اپنی قبر اور کتبہ تلاش کرتا ہے مگر اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندوں میں شمار ہوتا ہے نہ مردوں میں اور یہی اس کا عذاب ہے۔ رشید امجد نے وقت اور فنا کے تجریدی تصور کو قبرستان کے امیج کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہ فنا محض انفرادی زیاں نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی کے عروج و زوال اور حیات و موت سے جڑا ہوا تصور ہے۔ تاریخ کے قبرستان میں ہر قبر پر ایک کتبہ موجود ہے جس پر پوری داستان مرقوم ہے مگر کوئی تاریخ سے سبق لینے کو تیار نہیں۔ یہ سبق ان کے لیے خاص طور پر اہم ہے جو عروج کے دور سے گزر رہی ہیں۔ یہی اس کہانی کی تفہیم ہے۔

علی حیدر ملک کا افسانہ ''دہشت گرد چھٹی پر ہیں''، [۲۹] ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی وارداتوں کے پس پردہ خفیہ ہاتھوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ کہانی کا کردار جمیل شیرازی ''دہشت گردی: اسباب اور تدارک کی تدابیر'' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمی نار میں تقریر کرتا ہے اور حکومت کی اس مسئلے پر قابو پانے میں ناکامی کا اعلان کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ان دنوں دہشت گردی کے واقعات میں کمی آئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ دہشت گرد ان دنوں چھٹی منا رہے ہیں۔ اس امر کی داد حکومتی اقدامات کو نہیں دی جا سکتی۔ سیمی نار سے واپسی پر وہ گھر کے لیے روانہ ہوتا ہے مگر گھر نہیں پہنچتا۔ اس کی بیوی پولیس سے مدد طلب کرتی ہے مگر پولیس ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ پریس کانفرنس کرتی ہے، اس کے ساتھی صحافی احتجاج کرتے ہیں، خبر پھیلنے لگتی ہے تو ایک دن پولیس کے ترجمان کا بیان اخبارات میں شائع ہوتا ہے جس کے مطابق جمیل شیرازی نامی کوئی شخص ان کی تحویل میں نہیں۔ اگلے روز اس کی گولیوں سے چھلنی لاش سڑک کے کنارے پڑی ملتی ہے۔ اس پر انسانی حقوق کی تنظیمیں احتجاج کرتی ہیں۔ ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے اور عباس غوری اپنی

تقریر میں اس امر پر احتجاج کرتا ہے کہ کب تک دہشت گردوں کی جگہ بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر سزا دی جاتی رہے گی۔ اس روز وہ جلسے کے بعد گھر کے لیے روانہ ہوتا ہے مگر گھر نہیں پہنچتا۔ شہر میں احتجاج کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہانی ختم ہو جاتی ہے مگر جس تھیم پر یہ کہانی بنی گئی ہے اس کے مسلسل جاری و ساری رہنے کا تاثر قائم رہتا ہے۔ مصنف نے دہشت گردی کے نام پر حکومتی خفیہ ایجنسیوں اور سیکیورٹی اداروں کی شہریوں کے خلاف کارروائیوں کو موضوع بنایا ہے۔ عوام کو صرف دہشت گردہی نہیں، خود ان کے تحفظ پر مامور اداروں کی دہشت گردی کا بھی سامنا ہے جو عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں اور آزادیٔ رائے پر قدغن لگائے ہوئے ہیں۔ کہانی کا لوکیل اگرچہ حتمی طور پر بیان نہیں کیا گیا مگر کرداروں کے ناموں سے پاکستانی معاشرے کے خدوخال پہچانے جاتے ہیں۔ یوں یہ کردار دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو سکتے ہیں خاص طور پر وہ ممالک جہاں عوامی رائے کا احترام کم سے کم ہے اور جہاں حکومتیں جبر واستحصال کی خوگر ہیں، اس کہانی کا لوکیل ہو سکتے ہیں۔ اس کا زمانی تعین بھی ممکن نہیں کیوں کہ یہ واقعہ جس طرح عصری صورت حال کا ترجمان ہے اسی طرح ماضی کا عکاس بھی ہے۔ عوام کو ان کے ذہن اور زبان سے محروم کرنے کی ادا ہر زمانے میں صاحبانِ اقتدار کو محبوب رہی ہے۔

فوجی، بارلیش آدمی، تسبیح، خودکش اور بلٹ پروف جیکٹوں، سانپ اور گرگٹ کھانے والے انسان اور قبرستان کے امیجز سے ایک سرئیلی فضا کی تشکیل پاتی ہے جس کا کوئی نہ کوئی سرا اس فریبِ تخیل سے جا ملتا ہے جو انسان کو اس کے عمل اور اس کے ارادے کو کسی ان دیکھی وحشت سے باندھ دیتا ہے اور زندگی کے حقائق اپنی معنویت کسی اور رشتے سے اخذ کرتے ہیں۔ اشیا ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت مختلف جبلی اور معاشرتی رشتوں اور روابط میں بندھی ہوتی ہیں۔ ان میں گھن اور کراہت بھی ہے اور ضرورت اور خواہش بھی۔ لیکن ان کے اظہار کے بندھے ٹکے رستے انھیں اور معانی دے دیتے ہیں۔ یہ فاروق خالد کی خواب اور حقیقت کی سرحد پر جنم لیتی ایک کہانی ''کارگر''[۳۰] کی فضا ہے۔ جس میں معاصر زندگی کے اہم نشانات کو چن کر ان سے عصری تفہیم و تعبیر کی کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کی طوالت اس کی اثر آفرینی میں حارج ہوتی ہے لیکن اس کی مجموعی فضا پر ہراس، بے یقینی، تلخی، کراہت، جبر اور بظاہر اتفاقیہ محسوس ہونے والے واقعات کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ ہونے کا شبہ، زندگی کی اس مجموعی زمانی و مکانی صورت حال کو بیان کرتا ہے جو اردو گرد کے منظر نامے میں موجود ہے اور جس سے کہانی کے مصنف اور اس کے ممکنہ اولین قارئین کا واسطہ پڑ چکا ہے۔

پاکستان کے ایک ایسے دورافتادہ ضلع کی مکانی صورت حال مسعود صابرؔ کے افسانے ''سرخ،،[۳۱] میں اجاگر ہوتی ہے۔ جو چاروں صوبوں کے سنگم پر واقع ہے اور جہاں ایک معصوم دیہاتی شخص، اچانک دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو جانے کے باعث شدید ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہانی غیر شعوری طور پر ان دھماکوں کے دو مختلف ردِ عمل پیش کرتی ہے اور اگر چہ ان دونوں کے درمیان کسی مماثلت یا تقابل کا احساس کہانی کی بنت میں موجود نہیں لیکن اس کے بطون میں یہ تاثر واضح طور پر موجود ہے۔ دھماکوں کا ایک ردِ عمل تو کہانی کے راوی اور ضلع کے ڈپٹی کمشنر کا ہے جو خاصا غیر روایتی افسر ہے اور اپنے ضلع کے عوام کے بارے میں حساس بھی۔ اپنے ڈرائیور نواز کے بھائی کی نوکری کا بندوبست کرنے، اس کی محنت، سادگی، اور خلوص کی قدر دانی اور اس کی بیوی سکینہ سے اس کی محبت کی ستائش سے لے کر شہر میں ستے بازار کا اچانک دورہ کرنے تک وہ ایک. حساس اور نرم دل انسان محسوس ہوتا ہے۔ پہلے دھماکے کا اثر بھی اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ خود کو اپنی محبوب بیوی سے بھی بے نیاز محسوس کرتا ہے مگر جوں جوں دھماکوں کا سلسلہ دراز ہوتا ہے، اس کی احسیت میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے اور وہ ان کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ریاض کی کیفیت میں شدت بڑھتی جاتی ہے اور وہ دھماکوں کی بو سونگھتا پھرتا ہے تا کہ لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ہسپتال پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس کی ذہنی کیفیت بدل جاتی ہے، وہ ہر ایک سے لڑتا جھگڑتا ہے اور اپنی محبوب بیوی کی پٹائی کرتا ہے، دفتر والوں سے بھی جھگڑا کر بیٹھتا ہے اور تنگ ودو سے حاصل کی ہوئی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک مذبح خانے میں نوکری کر لیتا ہے ''جہاں گائیں کٹتی ہیں۔'' یوں افسانہ نگار دہشت گردی سے عوام الناس کے اذہان پر پڑنے والے شدید دباؤ اور اس کے دیرپا اور دوررس اثرات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ خون اور ادھڑے ہوئے گوشت کے مناظر ان کی شخصیتوں میں کیسے شدید انتشار کا باعث بنتے ہیں اور ان کی سائیکی پر کتنے منفی اثرات کے حامل ہوتے ہیں، یہی اس کہانی کی تھیم ہے۔

محمد حمید شاہد کی کہانی ''سؤر گ میں سؤر،،[۳۲] تمثیلی انداز میں عصری سیاسی و معاشرتی صورت حال کا تجزیہ کرتی ہے۔ بستی والے جنھیں بکریوں کے ریوڑ پالنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کا وصف ملا تھا اور جو اسے پاکیزہ فریضہ قرار دیتے تھے، جنگلی سؤروں کے حملہ آور ہونے سے پریشان تھے جو ان کی بکریاں ہلاک کر دیتے تھے۔ اس کے تدارک کے لیے انھوں نے کتے پالنے شروع کر دیے۔ مگر سؤروں کی تعداد میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اگر چہ انھوں نے بھی جواباً حفاظتی کتوں

کی تعداد بڑھائی مگر یہ کتے خود بھی غنیم سے مل گئے یا ان کے ڈر سے بستی والوں کی بکریوں کی حفاظت سے قاصر رہے ہے۔ علامتی سطح پر یہ عالمی گاؤں آباد کرنے کی خواہش میں بسی ہوئی بستیاں اجاڑ دینے والی مرگ آثار تھوتھنیوں کی کہانی ہے۔ معاصر صورت حال کے بیان کے لیے مصنف نے بکریوں، کتوں اور سوروں کے استعارے خوبی سے بیان کیے ہیں۔

ایک افغان بچی پروین کی مختصر زندگی کے طویل، گہرے اور شدید تجربات جو اس نے تیرہ برس کی عمر میں حاصل کیے تھے اور اپنی خداداد ذہانت اور زندگی کے کٹھن برتاؤ کی بدولت اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرنا سیکھ گئی تھی۔ زاہدہ حنا کی کہانی ''نیند کا زرد لباس'' [۴۳] میں بیان کیے گئے ہیں وہ کابل سے اپنے بچے کھچے خاندان اور ایک ہتھیلی سے محرومی کا داغ لیے باجوڑ پہنچی مگر حکام کی طرف سے کچھ عرصے بعد ہی باجوڑ خالی کرنے کا فرمان جاری ہوگیا اور وہ دوبارہ کابل کے لیے روانہ کر دی گئی۔ راستے میں امریکی بموں کی بارش میں اس نے آخری سانسیں لیں جب اس کی لاش باجوڑ پہنچی تو اس کی مٹھی میں ایک خط دبا تھا جو اس نے امریکہ کے صدر کے نام لکھ رکھا تھا۔ یہ طویل خط افغانستان کے بچوں کی فریاد ہے جس میں تتلیوں کی شکل کے بم برسانے سے لے کر، بچوں کی آنکھوں کے سامنے ان کے ماں باپ کو بہیمانہ طریقے سے مار ڈالنے کے مظالم کا شکوہ ہے۔ یہ خط اس منافقت کا پردہ چاک کرتا ہے جس کے تحت بموں کے ساتھ ساتھ خوراک کے بنڈل بھی طیاروں سے پھینکے جاتے ہیں۔ افغان بچوں اور امریکی بچوں میں کیا فرق ہے کہ بالی وڈ جا کر ہیرو بننے کے شوقین اور سسٹما سین اور کاجول کی تصویریں حجرے میں لگانے والے نوجوان بالآخر خونِ ناحق کی ارزانی دیکھ کر خود بھی خودکش بمبار بن جاتے ہیں۔ کہانی براہ راست امریکی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتی اور انسانیت کے قتلِ عام پر فریاد کرتی ہے۔

مسعود مفتی اگرچہ عام طور پر اپنے بیانیے کو ٹھوس واقعاتی حقیقت پر استوار کرتے ہیں۔ مگر ان کا افسانہ ''قیامت'' [۴۴] کہانی کے روایتی اسلوب سے ہٹ کر انشائیے کی سرحدوں تک جا پہنچتا ہے۔ کہانی کے تین کردار ہیں۔ وقت، اپنے اور غیر۔ اپنے یعنی اہلِ اسلام، غیروں، یعنی اہلِ مغرب سے مرعوب و متاثر بھی ہیں اور ان کے استحصال کا شکار بھی۔ تاریخ کے گزشتہ پڑاؤ میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب غیروں نے اپنوں سے روشنی مستعار لی تھی۔ اسی مستعار روشنی میں انھوں نے کائنات کی لگام تھام لی، برابری اور انصاف کے سنہرے اصول اور خودشناسی کا قوت آفریں ارادہ ان کے لیے ترقی اور آگہی کی کلید بن گیا جب کہ اپنے، طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ جو لوگ گڑھے میں اوپر تھے، انھوں نے

خود کو اوپر رکھنے کے لیے نیچے والوں کو تقدیر کا درس سے کر راضی برضا رہنے پر مجبور کر دیا۔ نچلے طبقے والے، اگلی دنیا کے حسین تصورات میں مست ہو کر حال سے بیگانہ ہوئے اور نکبت و ادبار کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ غیروں نے اپنی ایجادات اور ہتھیاروں کی طاقت سے انھیں اپنا مستقل غلام بنانے کی تیاری کر لی اور انھی کے اوپر والے طبقے کی مدد سے ان پر ہلاکت کی بارش کر دی۔ مرنے والوں کی لاکھوں روحیں جب آسمان پر عزرائیل سے الجھ پڑیں تو وہ دیر تک ہنستا رہا اور مرنے والوں کی روحیں خجالت اور تاسف میں غرق بے بسی سے اقوامِ نوح، عاد، ثمود اور مدین کی ہڈیوں کے ڈھیر پر اونگھتے عزرائیل کو دیکھتی رہیں۔ کہانی کیا ہے ایک طرح سے تاریخ کا تجزیہ ہے جس میں انسانیت کو دو ہی طبقوں میں تقسیم شدہ فرض کر لیا گیا ہے۔ یہ روایتی نقطۂ نظر جو مغرب اور اسلام کے درمیان موجود حریفانہ کشاکش پر یقین رکھتا ہے، عہدِ حاضر میں خاصا مقبول ہے۔ افسانہ نگار نے کہانی کی بنیاد اسی نقطۂ نظر قائم کی ہے اور غیر جانب داری سے دونوں قوتوں کے نیک و بد کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر مصنف کی زیادہ توجہ خود مسلمانوں کی اندرونی کمزوریوں پر مرکوز رہی ہے اور انھوں نے زوال کا حقیقی سبب خود اہلِ اسلام کے بالائی طبقے کی خود غرضی اور نچلے طبقے کی کم فہمی اور کمزور قوت ارادی ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کہانی پر مصنف کی آئیڈیالوجی کا غلبہ دکھائی دیتا ہے اور غالباً اسی سبب سے بیانیہ، راوی کے تبصروں سے اس قدر مغلوب ہے کہ کہانی کی فطری چال جا بجا لڑکھڑاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پرندوں اور جانوروں کی زبانی کسی خاص موضوع کو زیرِ بحث لانا مشرقی ادبیات کی کلاسیکی روایات کا حصہ رہا ہے اور عربی، فارسی اور ہندی ادب میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ پرویز انجم نے اپنی کہانی ''مہاجر پرندے''[۳۵] میں اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اگرچہ مصنف نے پرندوں کے درمیان مکالمے کی فضا پیدا کرنے کے لیے دونوں طرف کے دلائل و شواہد پیش کیے ہیں تاہم خود مصنف کا نقطۂ نظر غالب رہتا ہے۔ پرندے انسان کی وحشت و درندگی پر متعجب اور متاسف ہیں۔ یوں تو کہانی میں انسان کی ماحول سے مقاومت اور تسخیرِ فطرت کے جذبے کے تحت اس کے پامالی و بربادی کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ پس منظر میں سیاسی واقعات، عراق اور افغانستان پر امریکی بمباری اور اس کے محرکات و عواقب کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مصنف کا یہ خیال کہانی کے تانے بانے میں متحرک نظر آتا ہے کہ تباہی و بربادی اور ظلم و شقاوت کا شکار آخر ''ٹوپی اور پگڑی'' والے ہی کیوں ہوتے ہیں؟ گنبدوں والی سرزمینیں ہی کیوں نشانہ بنتی ہیں؟ یہ سوال افسانہ نگار

کے پورے ماحول اور عصری تناظر سے جنم لیتا ہے؟ واضح الفاظ میں مسلم دنیا سے اہلِ مغرب کی مخاصمت کے اسباب ومحرکات کہانی کے بنیادی سوال کی تشکیل کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ مصنف کا اصل مقصد انسان کی اپنے ماحول سے عمومی پیکار پر اظہارِ تاسف منظور ہے یا اہل مغرب کی مشرق پر عسکری یلغار کی شکایت۔ لیکن یہ دونوں موضوعات کہانی کی تھیم بن سکتے ہیں۔ واضح طور پر کہانی اجتماعی مسائل کے گرد گھومتی ہے، جو مقامی یا قومی بھی ہیں اور عالم گیر بھی۔

شیر شاہ سید کا افسانہ ''موت کا منظر''[۳۶] پاکستان میں اسلام کے مخصوص مسالک کی جارحانہ تبلیغ کے تکلیف دہ انداز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خواتین کا مرنے والوں کے گھر جا کر لواحقین کو نصیحت کرنا کہ اگر انھوں نے اپنا غم اس طرح برداشت نہ کیا جس طرح ان خواتین کا مسلک بتاتا ہے تو نہ صرف وہ بلکہ مرنے والے کی روح بھی عذاب کا شکار ہوگی، گھر والوں کو دوہری اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام کے مختلف مسالک کی جبری تبلیغ کا رجحان گزشتہ دو دہائیوں کے سیاسی واقعات اور پالیسیوں کا شاخسانہ ہے۔ یہ نہ صرف اہلِ پاکستان کے لیے تکلیف دہ ہے بلکہ پوری دنیا میں اسلام کو ایک تشدد پسند اور جبراً نافذ کیے جانے والے مذہب کے طور پر پیش کرنے کا باعث بھی ہے۔ افسانہ نگار نے واقعاتی بیانیے کی مدد سے اس تھیم کو پیش کیا ہے۔

عراق جو ہمیشہ سے کہانیوں اور طلسم زا فسانوں کا موضوع رہا ہے، امریکی حملوں کے بعد خاص طور پر اردو افسانے میں نمایاں ہوا ہے۔ ہارون الرشید اور شہرزاد کا بغداد جو کبھی حسن وخوبی کی تصویر تھا اب کھنڈر ہوتی عمارتوں اور جلتے ہوئے انسانی جسموں کا مدفن ہے۔ آج کی شہرزاد غول بیابانی جیسا ہیولیٰ بنی، راشن کے حصول کے لیے لمبی قطار میں لگی ہے۔ اس کے دل میں کتنے ہی جنازے رکھے ہیں باپ سے لے کر بیٹے اور بھائی سے لے کر شوہر تک، وہ کس کس کا سوگ کرے۔ یہ الطاف فاطمہ کے افسانے ''دیدوادید''[۳۷] کی شہرزاد ہے جو ایک ماضی پرست قوم کے ہارون الرشید کو اپنی داستان سناتی اور اسے یہ امانت سونپتی ہے کہ جب کبھی اس کی مجبوریوں کی بوجھ ہلکا ہو جائے تو وہ اسے لکھ سکے۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ دنیا بھر میں انسانی آزادی کا راگ الاپنے والی طاقت کسی کو سچ بولنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ بی بی سی کا صحافی ہو یا صدام کے مہلک ہتھیاروں کا جائزہ لینے والا اسلحہ کا سائنسی ماہر۔ خوبصورت الفاظ کے پردے میں گھناؤنے کھیل رچانے والی طاقتیں انسانوں کی زندگیوں کو پامال کیے چلی جاتی ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

عراق کی بربادی اور ماضی سے اس کا رشتہ انور زاہدی کے افسانے ''یہ جنگل کٹنے والا ہے'' کا

بھی موضوع ہے۔[۳۸] جس میں کہانی کا راوی خواب میں خود کو بغداد کے ماضی و حال کے نقطۂ اشتراک پر موجود پاتا ہے۔کل المعتصم باللہ کے بغداد میں کتب خانے جل رہے تھے، مینار و گنبد زمین بوس تھے اور گلیوں میں خون کی بساندتھی۔آج کے بغداد کی فضا میں دھواں ہی دھواں ہے۔زمین و آسمان بموں، راکٹوں اور میزائلوں کے دھوئیں سے جھلس رہے ہیں۔مساجد و مقابر، ہسپتال اور اسکول ، باغ اور کھیت اس سب لہو رنگ ہیں اور آج کا ہلاکو، اشرفیوں اور کنیزوں میں نہیں، اس سیال سیاہ توانائی کے ذخیروں میں دلچسپی رکھتا ہے جس سے اس کے کارخانے چلتے ہیں۔سات سو برس پہلے کے حملہ آوروں اور آج کے توسیع پسندوں میں کوئی فرق نہیں۔کہانی کی بنیادی تھیم یہ ہے کہ ترقی، روشن خیالی اور انسان دوستی کے دعوے محض خیالِ خام ہیں اور انسان آج بھی اسی حرص و ہوس کا اسیر ہے جو اسے انسانیت کے مقام سے گرا کر درندگی کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ٹاور آف بیبلون کا انہدام، اس سارے پس منظر میں ایک نئی معنویت پیدا کرتا ہے۔طاقت اور قوت کا ہر مظاہرہ بالآخر مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔یوں یہ ٹاور کہانی کا مرکزی استعارے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

عطیہ سید کا افسانہ ''بلقیان کا بت''[۳۹] ایک افغان بچے کی بارودی کھلونے سے دھجیاں بکھر جانے کی کہانی ہے۔یہ بچہ اپنے ملک کے غاروں میں ایک بت دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔یہ بت غالباً بدھا کا ہے، افسانہ نگار نے اس کی وضاحت نہیں کی لیکن جن اشاروں سے کام لیا ہے وہ یہی بتاتے ہیں اور احمد شاہ کا بدھا کا پرستار ہونا جو امن اور سکون کا پیغام لے کر آیا تھا، کہانی میں ایک گہری رمزیت پیدا کرتا ہے۔غیر ملکی جو بارلیش مقامی افراد کو بت کی مرمت کے لیے لاکھوں ڈالر دینے کو تیار ہیں لیکن ان کے مرتے ہوئے بچوں کو زندگی کی نوید دینے کو تیار نہیں، کہانی کی ایک اور جہت کو روشن کرتے ہیں۔دنیا بھر کے ثقافتی ورثے کی حفاظت پر مامور یہ غیر ملکی اس ثقافت کے وارثوں میں موت بانٹتے پھرتے ہیں اور انسانیت کے نام پر سنگین اور وحشیانہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اسلحے کے ڈھیر لگاتی قوتیں بالآخر کرۂ ارض پر موجود ہر ذی روح کی مکمل فنا کا باعث بن جاتی ہیں لیکن فنا کے انھی گھمبیر اندھیروں سے کوکائی اور بیسی لائی، انسانوں کی جلی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر سے کسمسا کر اٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر ایک نئی دنیا کی تعمیر میں شریک ہوتے ہیں۔انسان اگر چاہے بھی تو اپنی مرضی سے حیات کو مکمل طور پر فنا کر دینے کا مکلف نہیں ہے۔زندگی اس کی مرضی کے بغیر بھی اپنا تسلسل اور نمو جاری رکھنے کی اہل ہے۔پروین عاطف کی کہانی ''اینڈ آف ٹائم''[۴۰]

کسی ممکنہ ایٹمی جنگ کے بعد زندگی کی ازسرِ نو پیدائش اور نمو کو بیان کرتی ہے۔اس تفہیم میں طاغوتی طاقتوں کے جبر و استبداد پر ایک گہرا اور لطیف طنز موجود ہے جو خود کو فنا اور بقا پر قادر سمجھتی ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ زندگی کا مرکز ان کی رسائی سے کہیں دور واقع ہے اور اس مرکز سے کبھی بھی، کہیں بھی ایک نئے دائرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

احسان بن مجید کا افسانہ ''چق ماق''[۴۱] نئی تہذیب کے فنا آثار کمالات پر ایک طنز ہے۔نئی تہذیب جو اپنی ہی ایجادات کے ہاتھوں زوال اور شکستگی کا شکار ہے اور انسان کو اس کے سوالوں سے محروم کر کے اسے دوبارہ جنگلی غاروں کی طرف دھکیل رہی ہے۔گویا انسان کی وحشت اور حرص اسے تہذیب و تمدن سے بیگانہ کر کے بالآخر دوبارہ ہزاروں سال پہلے کی صورت حال میں دھکیل رہی ہے جہاں وہ آگ جلانے کے لیے اپنا اپنا چق ماق ڈھونڈنے میں مصروف ہوں گے۔انسانی ترقی کا یہ معکوس سفر کرۂ ارض کی تباہی اور اس کے تہذیبی ارتقا کی شکست و ریخت پر منتج ہوگا۔

یوں مجموعی طور پر اردو فکشن، خصوصاً اردو افسانہ اپنی سماجی صورت حال سے پورے طور پر جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔محسوس یہ ہوتا ہے جس شدت احساس سے عصری سیاسی واقعات کو اردو ادب میں موضوع بنایا گیا ہے اور جس گہرائی اور زمانی و مکانی وسعت میں اس موضوع کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ امریکی فکشن میں ناپید ہے۔پاکستانی افسانہ نگاروں نے گیارہ ستمبر کے نتیجے میں ملکوں اور قوموں کے درمیان جنم لینے والے نئے رشتوں کو غیر جانب داری اور دل سوزی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔اگرچہ کہیں کہیں خود اپنی بے بسی اور دوسرے گروہ کی شقاوت کا گلہ احتجاج کی لے اختیار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن زیادہ تر بحیثیت قوم خود اپنی کمزوریوں کا ادراک، اور غلطیوں کا اعتراف، افسانہ نگاروں کی قومی و عالمی سیاسی امور پر گہری نظر اور اسے سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی دلیل ہے۔

مغرب میں کہانی میں بیانیہ کی واپسی کا عمل نمایاں ہے لیکن اردو ادب میں بیانیہ کی شکستگی، موہوم فضا کی تشکیل، بے یقینی، دہشت اور خوف کے سائے نظر آتے ہیں۔کرداروں کی خود کلامی یا ان کی سوچ کا عمل کی جگہ لے لینا، سوالوں کی تیز دھار جن کے کوئی جواب نہیں، یہ تمام عناصر بیسویں صدی کے نصف اول میں دو بڑی جنگوں کے نتیجے میں ادب پر ہونے والے اثرات کی یاد دلاتے ہیں۔یہ اثرات ستر کی دہائی میں اردو ادب میں بھی نمایاں ہوئے تھے لیکن تب ان کے پس منظر میں وجودی فلسفے کی پرچھائیں تھی۔اجنبیت، بے معنویت اور بیگانگی، انفرادی مسائل تھے جو زندگی کی اجتماعی تگ و دو سے کٹ کر، ہستی کی داخلی گہرائیوں میں زندگی کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھا۔اس دور میں

فرد معاشرے سے کٹا ہوا، ماحول سے بیگانہ اور اجتماعی زندگی سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے لیکن اکیسویں صدی کے آغاز پر بساطِ سیاست پر ایسی بازی کھیلی گئی ہے کہ داخلیت، باطنی اضطراب اور وجودی کرب جیسی کیفیات غالباً ذہنی عیاشی معلوم ہونے لگی ہیں۔ فرد کا معاشرے میں جاری وساری مختلف النوع عوامل سے الگ تھلگ اور بے خبر رہنا ناممکن بن چکا ہے۔ زندگی کی تمام تر فعالیت معاشی، عسکری اور سیاسی منصوبہ بندیوں سے متاثر ہو رہی ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے لے کر سڑکوں پر جگہ جگہ لگائے گئے ناکوں تک، رکاوٹ اور بند باندھنے کا احساس زندگی کی ہر حرکت اور سمت کو متاثر کر رہا ہے۔ پاکستان میں انتشار اور زوال کا یہ عمل ہر ذہن کو سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اردو افسانے کی عصری حسیت محض سرد مہر اور غیر جانب دار بیانیے پر مشتمل نہیں ہے۔ اس میں گہری اور حساس جذباتی شدت بھی موجود ہے۔ یہ شدت کہیں تند و تلخ اسلوب کا روپ دھارتی ہے تو کہیں طنز کی تیز دھار کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے مگر افسانہ نگار اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اپنے قومی اور اجتماعی مسائل سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس کی نظر ذاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بہت آگے قومی اور عالمی افق کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک نئی طرح کا مزاحمتی رجحان ہے جسے ہم اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں متشکل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ مزاحمت کئی محاذوں پر بیک وقت سر اٹھا رہی ہے۔ سب سے بڑا اور سرگرم محاذ تو بڑی طاقتوں کی دھونس، دھمکی آمیز رویے، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی استحصال اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے کی شعبدہ بازی کے خلاف ہے۔ اردو افسانہ بین الاقوامی سطح پر اٹھنے والے طوفان اور اس کے عواقب سے بے خبر ہے نہ بے نیاز۔ اسے تیسری دنیا کے دور دراز، ترقی کے ثمرات سے محروم اور علم و آگاہی، دانش و بصیرت کے مغربی معیاروں سے بے خبر بستیوں میں بسنے والے افراد کی زندگی بھی اس طوفان کی زد میں لرزتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ غربت و افلاس کی آخری حدوں سے نیچے انسانیت کی دم توڑتی ہوئی آخری آواز بھی سنی جانے کے لائق ہے اور بڑے بڑے ایوانوں میں اسی انسانیت کے نام پر کھیلے جانے والے گھناؤنے کھیل کا پردہ چاک کیا جانا بھی ضروری ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک یہ استحصال بالعموم مغرب سے وابستہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب مغربی استعمار امریکہ کی صورت میں متشکل ہو گیا ہے جو گیارہ ستمبر کے بعد دنیا بھر میں جسے چاہے دہشت گردی میں الزام میں ملوث قرار دے کر اسے اپنے مفادات کا آلۂ کار بنا سکتا ہے۔ ادھر تیسری دنیا خصوصاً پاکستان میں اس واقعے کے کثیر الجہت اثرات سامنے آئے ہیں۔ خود امریکہ ہی کے پروردہ طالبان اب عالمی امن کے دشمن قرار پائے

ہیں اور پاکستان میں لال مسجد، باجوڑ، سوات اور ایسے ہی دیگر سانحوں میں ملوث قرار دیے جارہے ہیں۔ پاکستان کے سیکیورٹی اداروں کی کارروائیاں بھی کئی سوالات کا موجب بنی ہیں۔ لاپتہ ہونے والے افراد، آزادیٔ اظہار پر قدغن کے اقدامات، سیاسی مخالفین پر غیر انسانی تشدد اور بہیمانہ سلوک، جمہوریت کے نام اور کردار کے سامنے ایک سوالیہ نشان ثبت کرتے ہیں اور مابعد نوآبادیاتی صورت حال میں افراد اور اقوام کی آزادی کے سوال کو ایک نئے تناظر میں سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ استعماری قوتوں کے نرم رُو چہرے (soft image) کے عقب میں کارفرما گھناؤنے محرکات اور ان کے نتائج وعواقب اردو افسانے کی نظر سے اوجھل نہیں۔ پھر خود اپنے ہی ملکوں میں، خود اپنی حکومتوں کا عوام کے مفادات سے بے نیاز رہ کر، ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے سرگرمِ کار رہنا عوام کے مصائب میں کئی گنا اضافے کا باعث ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ردعمل کے طور پر منفی اثرات کی لہریں زور پکڑ رہی ہیں۔ ان میں اسلام کے نام پر تشدد پسندی کا مظاہرہ ہو، یا انتقام کے نام پر بے گناہ انسانوں کی جان و آبرو سے کھیلنے کا قابلِ نفرت اقدام، ایک مجموعی بے اطمینانی، ذہنی انتشار اور معاشرتی بگاڑ کو جنم دینے کا محرک ہے۔ اردو افسانہ اپنے عصری سماجی تناظر سے پوری طرح آگاہ ہی نہیں بلکہ اپنے طور پر ایک عمومی شعور اور بصیرت کا محرک بھی ہے۔ پھر یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اردو افسانہ محض اپنی جغرافیائی حدود کے اندر رہ کر زندگی کا مبصر اور ترجمان نہیں ہے بلکہ مجموعی انسانی صورت حال کے الم ناک احساس سے لبریز ہے۔ بغداد کے ہسپتالوں اور اسکولوں کی بربادی ہو یا فلسطین کے نوجوانوں کی موت سے ہم کلامی، افغانستان کے بچوں کے کھلونا بم ہوں یا باجوڑ کے شہریوں پر برستی آگ کی بارش، خودکش حملوں کا شکار ہونے والوں کی رقت انگیز کہانی ہو یا ان حملوں میں شریک ہونے والوں کی بے بسی اور بے چارگی کی انتہا، اردو افسانے کی فضا میں انسانی المیوں کا ہر رنگ جھلکتا ہے اور یہ انسان دوست لب ولہجہ محض سیاسی شعور کا زائیدہ نہیں بلکہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محبت اور ان سے بچھڑ جانے کی اذیت کا بھرپور اظہار ہے۔

حواشی

۱۔ کیلفس، کین (Ken Kalfus)، ۲۰۰۶ء، *A Disorder, Peculiar to the Country*، نیویارک: ہارپر پیرینئیل

۲۔ سنڈے ٹیلی گراف، لندن، ۳۰ ستمبر، ۲۰۰۶ء

http://www.encyclopedia.com/doc/1P2-8948657.html مورخہ ۳۰ اپریل، ۲۰۱۰ء

۳۔ نیشنل بک ایوارڈ یو ایس اے۔

۴۔ ڈیلیلو، ڈان (Don Delillo)، ۲۰۰۷ء، The Falling Man، نیویارک: سکریبنر

۵۔ ایسوسی ایٹڈ پریس فوٹو جرنلسٹ

۶۔ برطانوی دستاویزی فلم، Falling Man جو ۱۰ ستمبر ۲۰۰۷ء کو ڈسکوری چینل پر پیش کی گئی۔

۷۔ پین رفاکنر ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۰۹ء

۸۔ اونیل، جوزف (Joseph O Neill)، ۲۰۰۹ء، Netherland، نیویارک: ہارپر پیرینیل

۹۔

http://www.amazon.com/Netherland-Novel-Joseph-ONeill/dp/0307377040

مورخہ ۳۰ راپریل ۲۰۱۰ء

۱۰۔ گبسن، ولیم (William Gibson)، ۲۰۰۳ء، Pattern Recognition، نیویارک: جی پی پتنام سنز

۱۱۔ اپڈائک، جان (John Updike) ۲۰۰۶ء، Terrorist، نیویارک: الفریڈاے کنوف

۱۲۔ مارٹن ایمز، ۲۰۰۹ء، "He took the novel onto another plane of intimacy"، گارڈین: ۲۸ جنوری، ۲۰۱۰ء

http://www.guardian.co.uk/books/2009/jan/28/johnupdike-usa

مورخہ ۴ مئی، ۲۰۱۰ء

۱۳۔ نیویارک ٹائمز، ۲۱ مئی، ۲۰۰۶ء، "What Is the Best Work of American Fiction of the Last 25 Years?"،

http://www.nytimes.com/ref/books/fiction-25-years.html مورخہ ۴ مئی، ۲۰۱۰ء

۱۴۔ فوئر، جوتھن سفرون (Jonathan Safran Foer)، ۲۰۰۵ء، Extremely Loud and Incredibly Close بوسٹن: ہاؤٹن مفلین

۱۵۔ سمپسن، ڈیوڈ (David Simpson)، ۲۰۰۶ء، 9/11: The culture of Commemoration، شکاگو: یونی ورسٹی آف شکاگو پریس،

http://www.press.uchicago.edu/presssite/metadata.epl?mode=synopsis&bookkey=373157

مورخہ ۴ مئی، ۲۰۱۰ء

۱۶۔ حمید، محسن، ۲۰۰۷ء، The Reluctant Fudamentalist، یوکے: ہمیش ہملٹن

۱۷۔
http://www.9-11commission.gov/report/911Report.pdf

مورخہ ۴ مئی، ۲۰۱۰ء

۱۸۔ مفتی، مسعود، ۲۰۰۲ء، ''شناخت''، فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۷، ص ۱۱۳۔۱۲۹

۱۹۔ نسیم، افتخار، ۲۰۰۲ء، ''پردیسی''، فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۷، ص ۱۵۳۔۱۵۶

۲۰۔ اقبال، نیلوفر، ۲۰۰۳ء، ''اوپریشن مائیس''، فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۹، ص ۱۷۷۔۱۸۳

۲۱۔ اقبال، نیلوفر، ۲۰۰۳ء، ''سرخ دھبے (آپریشن مائس II)''، فنون، لاہور، شمارہ ۱۲۱، ص ۱۷۹۔۱۸۵

۲۲۔ عرفی، عرفان احمد، ۲۰۰۸ء، ''رئیلٹی شو''، سمبل، اسلام آباد، جلد ۲، شمارہ ۳۔۴، ص ۲۴۱۔۲۴۶

۲۳۔ حسین، خالدہ، ۲۰۰۹ء، ''ابن آدم''، مشمولہ مکالمہ، کراچی، ہم عصر اردو افسانہ ۲، جنوری ۲۰۰۸ء تا جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۲۳۷۔۲۴۴

۲۴۔ ندیم، فرخ، ۲۰۰۶ء ''چودھویں رات کی سرچ لائٹ''، مشمولہ نقاط، فیصل آباد، شمارہ ۳، ص ۱۰۱۔۱۰۴

۲۵۔ کریم، مصطفی، ۲۰۰۹ء، ''عجائب گھر''، مشمولہ، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۵، ص ۱۳۳۔۱۴۰

۲۶۔ سلیم، عاطف، ۲۰۰۶ء، ''لاوقت میں ایک منجمد ساعت''، مشمولہ نقاط، فیصل آباد، شمارہ ۳، ص ۸۹۔۱۰۰

۲۷۔ یاد، منشا، ۲۰۰۹ء، ''ایک سائنکلو سٹائل وصیت نامہ''، مشمولہ، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۵، ص ۱۵۱۔۱۶۲

۲۸۔ امجد، رشید، ڈاکٹر، ۲۰۰۸ء، ''مجالِ خواب''، مشمولہ، سمبل، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۲۹۔ ملک، علی حیدر، ''دہشت گرد چھٹی پر ہیں''، مشمولہ، سمبل، اسلام آباد، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۰۔۱۳۲

۳۰۔ خالد، فاروق، ۲۰۰۹ء، ''کارگر'' مشمولہ، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۵، ص ۱۸۹۔۲۰۱

۳۱۔ صابر، مسعود، ۲۰۰۸ء، ''سرخ''، مشمولہ دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۳، ص ۱۱۸۔۱۳۲

۳۲۔ شاہد، محمد حمید، ۲۰۰۴ء، ''سؤرگ میں سؤر''، مشمولہ مرگ زار، کراچی: اکادمی بازیافت، ص ۹۷۔۱۰۵

۳۳۔ حنا، زاہدہ، ۲۰۰۹ء، 'نیند کا زرد لباس''، مشمولہ، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۵، ص ۱۷۶۔۱۸۸

۳۴۔ مفتی، مسعود، ۲۰۰۳ء، ''قیامت''، مشمولہ، فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۹، ص ۱۴۷۔۱۴۹

۳۵۔ انجم، پرویز، ۲۰۰۸ء، ''مہاجر پرندے''، مشمولہ، ادبیات، خصوصی شمارہ، ۲۰۰۸ء، ص ۴۶۔ ۵۱

۳۶۔ سید، شیر شاہ، ۲۰۰۹ء، ''موت کا منظر''، مشمولہ، دنیا زاد، کراچی، کتاب ۲۵، ص ۲۰۲۔ ۲۱۰

۳۷۔ فاطمہ، الطاف، ۲۰۰۳ء، ''دیدوادید''، مشمولہ فنون، لاہور، شمارہ ۱۲۱، ص ۱۳۶۔۱۴۶

۳۸۔ زاہدی، انور، ۲۰۰۸ء، ''یہ جنگل کٹنے والا ہے''، مشمولہ ''مندر والی گلی''، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ص ۱۳۷۔۱۴۷

۳۹۔ سید، عطیہ، ۲۰۰۳ء، ''بلقیان کا بت''، مشمولہ فنون، لاہور، شمارہ ۱۱۹، ص ۱۹۲۔۱۹۶

۴۰۔ عاطف، پروین، ۲۰۰۴ء، ''اینڈ آف ٹائم''، مشمولہ فنون، لاہور، شمارہ ۱۲۲، ص ۱۸۸۔ ۱۹۳

۴۱۔ مجید، احسان، ۲۰۰۷ء، ''چق ماق''، مشمولہ 'معاصر''، لاہور، جلد ۷۔۸، شمارہ ۱۔۴، ص ۲۱۹۔۲۲۲

الطاف فاطمہ

دیداوید

یہ بغداد ہے۔ ہارون الرشید کا بغداد، جہاں کبھی ہارون الرشید رات کے وقت بھیس بدل کر گلی محلوں کا گشت لگایا کرتا تھا اور اس کا وزیراعظم اور دستِ راست جعفر برمکی اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔ وہ عام شہری کی طرح کھلے بندوں گھوما پھرا کرتے تھے۔ ہر شام ایک نئے بھیس اور ایک مختلف روپ میں اپنے شہر کی گہما گہمی اور رونقوں میں بہ نفس نفیس خود شامل اور شریک ہوتے۔ کبھی دجلہ وفرات کے ساحلوں پر مچھیروں اور کشتی رانوں کے درمیان ان ہی کے انداز میں اُٹھ بیٹھ کر ان کی باتوں اور ان کی زندگی کی الجھنوں سے آگاہی حاصل کرتے۔ ان کی باتوں اور چٹکلوں کے بارے میں۔ سچ ہی کہا جاتا ہے کہ تاج ور کبھی چین کی نیند نہیں سوتا۔ وہ بے کل رہتا ہے۔ وزیراعظم وفادار ہو تو وہ بھی رات اپنے بستر پر ہی کروٹیں بدل بدل کر بسر کرتا ہے۔

مگر میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بغداد کے کوچہ و بازار میں گشت لگانے والے خلیفۂ وقت کو یہ اطمینان رہتا تھا کہ اس کا شہر آباد ہے۔ اس کے سُوق، بازار اور منڈیوں میں مال فراوانی سے موجود ہے۔ پھل، سبزیاں، اناج اور ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی بکثرت اور عام بِک رہی ہیں۔ کہیں بھی کوئی سینکشن نہیں لگا ہوا ہے۔ یہ بات وہ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ یہ خود ان کی اپنی آنکھوں کا دیکھا حال ہے۔ ابھی ابھی ان کے قریب سے نان فروش آوازیں لگاتا گزرا ہے۔ یہ لوگ لمبی لمبی گرما گرم روٹیوں کے تھان کے تھان اپنے کندھوں پر لٹکائے آوازیں لگاتے ہیں۔ بھٹیارنیں اپنے تندوروں کو دہکائے گرم گرم تازہ تازہ قلچے اور نان لگا رہی ہیں۔ سقّے اور شربت بیچنے کے گلاسوں میں یوں مؤدب ہو کر پیش کرتے ہیں گویا خاص الخاص جامِ کوثر پیش کرتے ہیں والے پیاسے ازدحام کو اپنے اپنی مرغوب اور دلچسپ صداؤں سے پینے پلانے پر اکساتے ہیں اور ان کے حسب فرمائش، بلور کے انواع و اقسام اور دور دراز سے آنے والے قاقم و سنجاب، مخمل،

گیارہ ستمبر کا دن عہد جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے، جب پرانی بین الاقوامی زندگی کی بساط الٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس الٹی ہوئی بساط کو، اس نئے رشتے کے پیچ و خم کو، ہر ایک نے اپنے اپنے فکری، تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ امریکہ اور پاکستان، دونوں ممالک میں اس موضوع پر کئی اہم ناول اور افسانے تخلیق ہو چکے ہیں۔

ادب تاریخ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سیاسی اور سماجی تاریخ کے کئی پہلو، جہتیں اور پرتیں صرف ادب ہی میں رونما ہوتی ہیں۔ اسی لیے ادب کے سماجی مطالعے کو جدید بین العلومی تنقید میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے نہ صرف گیارہ ستمبر کے موضوع پر لکھے جانے والے منتخب، پاکستانی اردو فسانوں کو یک جا کر دیا ہے بلکہ اردو فکشن کے سماجی مطالعے پر مبنی ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں ۱۱/۹ کے بعد لکھے جانے والے پاکستانی اور امریکی فکشن کا تقابلی تجزیہ بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد میں استاد ہیں اور ان کی کئی کتب اور تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اندرون اور بیرون ملک، متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی مقالات پیش کر چکی ہیں۔

Rs. 325.00

پورب اکادمی